بہ سلسلہ ”فکرِ دیوبند: ایک تعارف“

پہلا علمی محاضرہ

برموضوع

اہل السنة والجماعة

تعارف وخصوصیات

ترتیب

مفتی محمد نوشاد نوری قاسمی

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

باہتمام

حجة الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

فہرست مضامین

حرف آغاز

دار العلوم وقف دیوبند میں قائم حجۃ الاسلام اکیڈمی نے، روز اول سے، صحیح اسلامی فکر کا تعارف اور اس کی نشر واشاعت؛ نیز باطل افکار ونظریات کا علمی تعاقب اور عالم اسلام پر مؤثر تحریکات وفکری مذاہب کا تحقیقی جائزہ، اپنے قیام کا ایک اہم مقصد بنا رکھا ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے جہاں متعدد سرگرمیاں جاری ہیں، وہیں علمی محاضرات کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے، چناں چہ مختلف موضوعات پر، علمی اور تحقیقی محاضرے شائع ہوکر، مقبول خاص وعام ہو چکے ہیں، زیر نظر محاضرہ بعنوان: ''فکر دیوبند: ایک تعارف''، اسی مبارک سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

علمائے دیوبند، اہل سنت والجماعت کے تاریخی تسلسل کی علامت، اور اہل سنت والجماعت کی تمام خصوصیات کے حامل، منتخب جماعت ہیں، جنہیں اللہ تعالی نے، برصغیر کے مسلمانوں کی فکری، علمی، اور عملی قیادت کے لیے انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں، پیدا کیا، اس جماعت نے اہل سنت والجماعت کے معتدل افکار ونظریات کو اپنی تگ ودو کا مرکز بنایا، اور مختلف اسباب وعوامل کی وجہ سے، امت میں پیدا ہونے والی فکری وعملی بے راہ روی کو اپنے علم اور حکمت وبصیرت سے، دور کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

اہل سنت والجماعت کے تعارف وخصوصیات کے جانے بغیر، چوں کہ علمائے دیوبند کا تعارف نامکمل؛ بلکہ ناممکن ہے، اس لیے پہلا محاضرہ اہل سنت والجماعت کے تعارف اور ان کی خصوصیات کے بیان کے لیے مخصوص ہے، دوسرا محاضرہ ان شاء اللہ اہل سنت والجماعت کے فکری اور عملی وارثین: علمائے دیوبند اور ان کے روشن کارناموں کے لیے مخصوص ہوگا، جس میں معروضی اور تجزیاتی انداز میں، ثابت کیا جائے گا کہ علمائے دیوبند کن خصوصیات کی بنیاد پر، اہل سنت والجماعت کے نمائندہ ہیں، اور اس لقب کا ان پر چسپاں کیا جانا گروہی تعصب یا کسی خوش فہمی کی بنیاد پر نہیں ہے؛ بلکہ ان کے ذاتی احوال واوصاف، ان کے کارنامے، اور امت کے لیے ان کی تڑپ، اسلام کی فکری

سرحدوں کی حفاظت کے لیے، ان کی تجدیدی سرگرمیاں، انہیں اس منصب عظیم پر لا کھڑا کرتی ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ محاضرہ کی زبان سادہ اور عام فہم، ترتیب اچھوتی، اور انداز دلکش ہو، اس کے مشمولات میں ذرہ برابر بھی، انحراف اور اجتہاد کو جگہ نہیں دی گئی ہے، اور اس نزاکت کے لیے، اس پر بار بار نظر ثانی کی گئی ہے؛ لیکن لاشعوری غلطیوں سے حفاظت کا دعوی نہیں کیا جاسکتا، اہل علم سے امید ہے کہ محاضرہ پڑھنے کے بعد، اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں گے۔

اس موقع پر حجۃ الاسلام اکیڈمی کے روح رواں اور فعال ناظم، جناب مولانا محمد شکیب صاحب قاسمی کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی؛ کیوں کہ یہ محاضرہ اپنے آغاز سے لیکر، اشاعت کے مرحلے تک، جناب موصوف کے اصرار وتوجہات کا مرہون منت ہے، اس لیے موصوف کے لیے شکریہ کے کلمات، رسمی یا خانہ پری کے لیے نہیں؛ بلکہ مسلسل عنایات وتوجہات، اور اکیڈمی کے لیے ان کی بے پناہ مخلصانہ کوششوں کی وجہ سے، وہ اس کے حقیقی حق دار ہیں۔

بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے، اور وہ عقیدہ، عمل واخلاق نصیب کرے جو اللہ کو پسند ہوں۔ آمین یا رب العالمین

محمد نوشاد نوری قاسمی
استاذ دار العلوم وقف دیوبند
۲/ذی الحجہ/۱۴۳۶ھ

فکرِ دیو بند: ایک تعارف

اہل سنت والجماعت کے اصول

"مسلک دیو بند" عصر حاضر میں اہل سنت والجماعت کے معتدل اور متوازن افکار ونظریات کا حامل مسلک ہے، اس مسلک میں اہل سنت والجماعت کے تمام اصول اور خصوصیات اور علمی وعملی امتیازات، بغیر کسی کمی وزیادتی کے موجود ہیں، مسلک دیو بند کا صحیح تعارف کرانے کے لئے اہل سنت والجماعت کے بنیادی اصول اور تعارف سے واقفیت ضروری ہے۔

اہل سنت والجماعت کی تعریف

اہل سنت والجماعت درحقیقت اس نیک بخت اور باتوفیق جماعت کا عنوان ہے، جس نے ہر دور میں علمی، عملی اور فکری امانتوں کی حفاظت کی ہے، جو ہر دور میں صراطِ مستقیم پر گامزن رہی ہے۔ اسلام کی نشر واشاعت اور اس کی تبلیغ جس کا مقصد حیات ہے، شمع اسلام کو ہر طرح کے مخالف طوفانوں سے محفوظ رکھنا، جس کا امتیازی شعار ہے اور جن کی بے مثال قربانیوں سے اسلام کی فکری، علمی اور عملی سرحدیں ہر دور میں محفوظ رہی ہیں۔

اہل سنت والجماعت وہ فرقۂ ناجیہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئی ہے کہ وہ امت کے اختلاف، تفرقہ اور فتنہ انگیزی کے زمانہ میں بھی حق پر قائم رہے گا، جن سے علم وعمل کے چراغ روشن ہوں گے اور دین کا اصلی روشن چہرہ ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ رہے گا۔ بہت سی احادیث میں امت کے صحیح فرقہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان روایتوں کا مصداق اہل سنت والجماعت ہی ہیں۔ ذیل میں کچھ روایات درج کی جارہی ہیں۔

(۱) لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى يأتي أمر الله وهم كذلك.

آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی ایک جماعت غالب رہے گی، حق پر قائم

رہے گی، ان کے مخالفین ان کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے گا اور وہ انہیں خصوصیات کے ساتھ باقی رہے گی۔ (۱)

(۲) یہ دین مسلسل باقی رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لئے لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔ (۲)

اس حدیث میں اس خاص جماعت سے مراد "اہل سنت والجماعت" ہیں۔

(۳) آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس دین میں برابر ایسے پودے لگاتا رہے گا جنہیں وہ اپنی طاعت میں استعمال کرے گا۔ (۳)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: بنی اسرائیل اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ستر فرقے ہلاک ہوگیے، ایک فرقہ نجات پا گیا، میری امت بہتّر فرقوں میں بٹے گی، اکہتر فرقے ہلاک ہوں گئے، ایک فرقہ نجات پائے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی جماعت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "الجماعة، الجماعة" یعنی جماعت کو مضبوطی سے پکڑنے والی جماعت۔ (۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: قوم بنی اسرائیل پر جو حالات آئے، میری امت بھی ان تمام حالات سے برابر دوچار ہوگی۔ اگر بنی اسرائیل میں کسی شخص نے اپنی ماں سے کھلم کھلا زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی ایسا کرنے والا ہوگا۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، سارے فرقے دوزخی ہیں، سوائے ایک جماعت کے۔ صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ ایک جماعت کون سی ہے؟

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ: وہ شریعت جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں (اس کی پیروی کرنے والی جماعت)۔ (۵)

اس حدیث میں جس ایک جماعت کے جنتی ہونے کا اعلان کیا گیا ہے اور اس جماعت کی جو

---

(۱) مسلم شریف: حدیث: ۱۹۲۰ (۲) مسلم شریف: حدیث: ۱۹۲۲ (۳) ابن ماجہ شریف: حدیث: ۸
(۴) مسند احمد: حدیث: ۱۲۴۷۹ (۵) ترمذی شریف: حدیث: ۲۶۴۱

علامتیں بتائی گئی ہیں، وہ صرف اہل سنت والجماعت میں ہی پائی جاتی ہیں۔

اہل سنت والجماعت کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ عقیدہ اور عمل میں صحیح اسلامی افکار و اعمال کے پابند ہوتے ہیں، ان کے سارے عقیدے وہی ہیں جو قرآن کریم اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، نہ ان پر وہ اضافہ کرتے ہیں اور نہ کمی کرتے ہیں اور نہ اس میں کسی طرح کی کمی کو جائز سمجھتے ہیں۔ ذیل میں اہل سنت والجماعت کے فکری اور عملی نظریات کا ماخذ اختصار کے ساتھ پیش ہے:

اہل سنت والجماعت کے افکار ونظریات کے مآخذ

اہل سنت والجماعت اپنے افکار ونظریات کی بنیاد چار قسم کے مآخذ پر رکھتے ہیں:

(۱) قرآن کریم (۲) احادیث صحیحہ (۳) آثار صحابہؓ (۴) اجماع امت

(۱) قرآن کریم

قرآن کریم پوری شریعت اسلامیہ کا سب سے پہلا ماخذ ہے، یہ وہ کتاب ہدایت ہے جس میں ہدایت کا پورا سامان اور فکری گمراہی اور عملی انحراف سے نجات کا کافی سبق موجود ہے۔ قرآن کریم نے سابقہ اقوام کی گمراہی اور تباہی نیز ان کے مقابلہ میں انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے حضرات کی کامیابی وکامرانی کے واقعات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے اللہ کے پسندیدہ عقائد و اعمال کے خدوخال بالکل نمایاں ہوجاتے ہیں۔ قرآن کریم میں عقیدہ وعمل سے متعلق بہت سی ہدایتیں ملتی ہیں۔

(۱) صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی تاکید اور صراطِ مستقیم کی نشان دہی۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُو السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ(۱)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ.(۲)

(مغضوب علیهم، جن کے پاس علم ہے؛ مگر عمل نہیں کرتے، وَلَا الضَّآلِّیْنَ سے وہ لوگ

(۱) سورہ انعام: آیت ۱۵۳ (۲) سورۂ فاتحہ: ۷

مراد ہیں، جن کے پاس علم ہی نہیں۔(۱)

(۲) گمراہ قوموں کی کج روی کا بیان

مختلف آیات میں۔

(۳) ان آیتوں کی تعیین جو عقیدہ وعمل کے باب میں حجت بن سکتی ہیں:

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ. هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَات“

اس آیت میں نشان دہی کی گئی ہے کہ محکم آیات ہی حجت ہیں، متشابہ آیتیں عقیدہ وعمل کے باب میں حجت نہیں، ان پر ایمان لانا کافی ہے۔

(۴) اختلاف امت کے موقع پر اختلاف کے حل کرنے کا قرآنی نسخہ:

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.(۲)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (۳)

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَی اللّٰهِ. (۴)

یہ قرآن کریم کا بہت ہی اہم اصول ہے کہ اختلافِ امت کے موقع پر قرآن کریم کی آیات محکمہ اور احادیث صحیحہ کو معیار بنایا جائے اور اس کی روشنی میں مسئلہ کو حل کیا جائے اور ذاتی رائے اور نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ قرآن کریم کا یہ سنہرا اصول خاص طور سے عقیدہ کے باب میں اساس کا درجہ رکھتا ہے۔

(۱) بیان القرآن: حضرت تھانویؒ (۲) نساء: ۵۹

(۳) نساء: ۶۵ (۴) شوریٰ: ۱۰

(۲) احادیثِ صحیحہ

شریعت اسلامی کا دوسرا اور بہت ہی مفصل ماخذ، نبی کریم ﷺ کی احادیث ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح وتفسیر کھول کھول کر بیان فرمادیں۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے قول وفعل سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا۔ درحقیقت آپ علیہ السلام کی پوری مبارک زندگی، قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ کے ہر باب میں احادیث شریفہ ایک مستقل ماخذ اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، البتہ حدیث میں چوں کہ صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے احادیث کے ذخیرہ میں سے صرف صحیح حدیثیں ہی عقیدہ کے باب میں معیار اور حجت ہیں۔

عقیدہ کے تعلق سے حدیثی اصول

(۱) صراطِ مستقیم کی وضاحت

آپ علیہ السلام نے صراطِ مستقیم کی وضاحت نظری اعتبار سے بھی کی اور عملی اور تطبیقی اعتبار سے بھی، نظریاتی اعتبار سے آپ علیہ السلام نے قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا:

ترکتُ فیکم أمرین لن تضلّوا ما تمسّکتم بهما، کتاب الله وسنة نبیه. (۱)

اور عملی اعتبار سے بھی آپ نے اس کی وضاحت کی، چنانچہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرقہ ناجیہ کی تعیین کرتے ہوئے بتایا کہ **ما أنا علیه و اصحابی.** (۲)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک سیدھا خط کھینچا اور دائیں بائیں بہت سے خطوط کھینچے، سیدھے خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ اللہ کا راستہ ہے، اور ٹیڑھے خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ گمراہی کے راستے ہیں، ان میں ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا ہوا

(۱) موطا مالک: حدیث: ۳۳۳۸ (۲) ترمذی شریف: حدیث نمبر: ۲۶۴۱

ہے، پھر آپ ﷺ نے وہ آیت تلاوت کی:

وَ أَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْماً الآیة. (۱)

(۲) قیل وقال اور غیر ضروری سوالات سے اجتناب

آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے غیر ضروری سوالات کو پسند نہیں فرمایا۔ قرآن کریم میں بھی یہ حکم موجود ہے، غیر ضروری سوالات کسی بھی مسئلہ میں ناپسندیدہ ہیں، البتہ عقیدہ کے بارے میں قیل و قال بہت زیادہ ناپسندیدہ ہے؛ کیوں کہ اس سے گمراہی کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ: جو چیزیں میں نے چھوڑ دی ہیں تم ان کی کھود کرید مت کیا کرو، کیوں کہ پہلی امتیں آپسی اختلاف اور انبیاء کرام سے کثرت سوالات کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ لہٰذا جس چیز کا میں حکم دوں اسے جتنا ہوسکے کرلیا کرو اور جس چیز سے میں تم کو روک دوں اس سے باز رہا کرو۔ (۲)

(۳) دین میں بدعات وخرافات پیدا کرنے کی حرمت

حدیث میں آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا "**کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار.**" (۳)

اس مضمون کی بہت سی روایات ہیں۔

(۴) دین میں اپنی رائے اور خواہش نفس کی پیروی کی ممانعت

آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: بنی اسرائیل کا نظام صحیح چل رہا تھا، پھر ان میں مولّدون یعنی باندیوں کی اولاد پیدا ہوگئے اور انہوں نے اپنی رائے سے مسئلہ بیان کرنا شروع کیا تو خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ (۴)

(۱) مسند احمد: حدیث ۴۲۴۱ (۲) ابن ماجہ شریف: حدیث: ۲

(۳) ابن ماجہ شریف: ۴۵) (۴) ابن ماجہ شریف: حدیث: ۵۵

(۵) دین کے باب میں اختلاف اور نزاع کی ممانعت

آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ہدایت کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوتی، مگر اس میں لڑنے جھگڑنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔(۱)

(۶) سواد اعظم کی پیروی کی تلقین

سواد اعظم سے مراد امت کی وہ سب سے بڑی جماعت ہے جو اپنے فکر وعمل سے ہر دور میں اسلام کی حفاظت کرتی رہے گی، آپ علیہ السلام نے عام مسلمانوں کو سہل انداز میں صراطِ مستقیم کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ امت کی بڑی جماعت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا:

اتبعوا السواد الأعظم فانه من شذ شذ فی النار

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت گمراہی میں مبتلا نہیں ہوسکتی، اگر تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کو لازم پکڑو۔(۲)

(۷) بعض گمراہ فرقوں کی نشان دہی

نبی کریم ﷺ نے امت کی فکر وعمل کی حفاظت کے لیے بعض گمراہ فرقوں کی نشاندہی بھی کی ہے، تاکہ امت ان فرقوں سے اوران کے عقائد واعمال سے محفوظ رہے، ان میں سے چند فرقوں کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

(الف) منکرین حدیث کی تعیین

مسلمانوں میں ایک فرقہ ہے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا ہے۔ درحقیقت وہ منکرین حدیث ہیں۔ اس فرقہ کے لوگوں نے اپنی خواہشات نفس کی پیروی اور مستشرقین کے اعتراضات سے مرعوب ہوکر احادیث شریفہ کا انکار کردیا، انہیں قصہ وکہانی سے تعبیر کیا، یہ فرقہ کھلے یا چھپے انداز سے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں سرگرم عمل ہے۔

(۱) ابن ماجہ شریف: حدیث: ۴۷ (۲) ابن ماجہ شریف: حدیث: ۳۹

نبی کریم ﷺ نے اس فتنہ کی پیشین گوئی فرمادی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عنقریب ایسا ہوگا کہ ایک آدمی اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا، اسے میری حدیث سنائی جائے گی، تو وہ کہے گا ہمارے اور تمہارے درمیان (فیصلہ کن کتاب) صرف کتاب اللہ ہے، لہٰذا ہم اس میں جو حلال پائیں گے اسے حلال سمجھیں گے اور جو اس میں حرام پائیں گے اسے حرام سمجھیں گے، آگاہ رہو کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی طرح ہے۔(۱)

(ب) منکرین ختم نبوت کی تعیین

آپ علیہ السلام نے اس بات کی بھی پیشین گوئی فرمادی تھی کہ: میری امت میں جھوٹے نبی پیدا ہوں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: میری امت میں تیس جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہوں گے، سب کا دعویٰ ہوگا کہ وہ نبی ہے جب کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔(۲)

(ج) خوارج کے بارے میں آپ علیہ السلام کا ارشاد

خوارج وہ جماعت ہے جو جنگ صفین کے ابتدائی مرحلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، جب حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ نے باہمی صلح مندی کے ارادے سے تحکیم کے مشورہ کو قبول فرمایا تو یہ لوگ **إن الحکم الا للّٰہ** کا نعرہ لگاتے ہوئے جماعت سے الگ ہوگئے اور حضرت علیؓ، معاویہؓ اور دیگر تمام صحابہؓ کو کافر کہنے لگے۔ بعد میں حضرت علیؓ نے ان سے جنگ بھی کی۔ آپ علیہ السلام نے خوارج کا حکم اور علامتیں حدیث میں بتائی ہیں۔

آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: **الخوارج کلاب النار.** (۳)

میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ قرآن بہت پڑھیں گے، مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔(۴)

(۱) سنن ابن ماجہ: عن مقدام بن معد یکرب، حدیث نمبر: ۱۲ (۲) ابوداؤد شریف: حدیث نمبر: ۴۲۵۲، عن ثوبان

(۳) ابن ماجہ: حدیث ۱۷۳ (۴) ابن ماجہ: حدیث نمبر: ۱۷۲

(د) مرجیہ اور قدریہ کے بارے میں آپ علیہ السلام کی پیشین گوئی

مرجیہ وہ فرقہ ہے جو بندے کو مجبورِ محض سمجھتا ہے، خاطی اور گناہ گاروں کو بھی وہ گناہ پر معذور سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک گناہ سے ایمان میں کوئی کمی نہیں آتی اور ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے، اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔

قدریہ وہ فرقہ ہے جو اللہ کی تقدیر کا منکر ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے اعمال کا خود خالق ہے، اللہ نے کوئی چیز متعین نہیں کی، معتزلہ اسی فرقۂ قدریہ کی ایک شاخ ہیں۔

ان دونوں فرقوں کے بارے میں آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: میری امت میں دو جماعتیں ایسی ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں (۱) مرجیہ (۲) قدریہ(۱)

(ہ) بدعات و منکرات پھیل جانے کی نشان دہی

نبی کریم ﷺ نے اس بات کی بھی پیشین گوئی فرمائی تھی کہ میری امت میں بدعات و منکرات پھیل جائیں گی اور کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو ہمارے دین کو بدل دیں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں حوض پر تم سے پہلے پہنچوں گا جو شخص بھی حوض پر پہنچے گا وہ حوض کوثر میں سے پیے گا اور جو اس میں سے پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہیں ہوگا، پھر کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے جنہیں میں پہچان لوں گا اور وہ مجھے پہچان لیں گے؛ لیکن میرے اور ان کے درمیان ایک آڑ کھڑی کردی جائے گی، میں کہوں گا: یہ مجھ سے ہیں، تو کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ ﷺ کے بعد کتنی تبدیلی کردی، تو میں کہوں گا دوری ہو، دوری ہو، ان لوگوں کے لیے جنہوں نے دین کو بدل دیا۔ (۲)

اس حدیث میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جنہوں نے فکر و عمل میں کوئی نئی بدعت ایجاد کی۔

(و) فتنوں کی نشان دہی

آپ علیہ السلام نے بہت سارے فتنوں کی نشان دہی فرمائی اور یہ بتایا کہ یہ فتنے مسلمان کو

(۱) سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۴۹، عن ابن عباسؓ (۲) بخاری: حدیث ۷۰۵۹

اسلام اور نیک اعمال سے برگشتہ کرنے کے لئے پیدا ہوں گے، ان فتنوں میں لوگوں کا ایمان اور نیک اعمال پر باقی رہنا مشکل ہوگا؛ لیکن کامیاب لوگ وہی ہوں گے جو ان حالات میں بھی دین کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تاریک راتوں کے ٹکڑوں کی طرح فتنے ہوں گے، لوگ شام میں مومن ہوں گے تو صبح کافر ہو جائیں گے اور صبح مومن ہوں گے تو شام میں کافر ہو جائیں گے، لوگ دنیا کے تھوڑے سے نفع کی خاطر، اپنا دین فروخت کردیں گے۔ (۲)

(۲) کتاب الفتن شیخ نعیم حماد: حدیث ۱۳

(۳)اجماع امت

عقیدہ کے باب میں اہل سنت والجماعت کا تیسرا ماخذ اجماع امت ہے۔امت میں سب سے پہلا درجہ صحابہ کرامؓ کو حاصل ہے، لہٰذا ان کا اجماع سب سے مضبوط اور اہم ہے۔عقیدہ سے متعلق صحابہ کرامؓ سے متعدد چیزوں پر اجماع ثابت ہیں۔

(۱)خلافت ابوبکر صدیقؓ پر اجماع

(۲)مشورے سے خلیفہ کا انتخاب

(۳)کسی متفق علیہ خلیفہ کا اپنے بعد والے خلیفہ کا نام زد کر دینا

(۴)نماز تراویح کی جماعت پر اجماع

(۵)جمع قرآن کا اجماع

اسی طرح سے بعد والوں کا اجماع بھی معتبر ہے بشرطیکہ اجماع کی ساری شرطیں پائی جائیں، عقیدہ کے باب میں بعد کے ادوار میں بھی مجتہدین امت محمدیہ کا اجماع ملتا ہے، جیسے خلق قرآن کے مسئلہ پر علماء امت کا اجماع۔

اجماع کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے

اجماع کا ثبوت خود قرآن وحدیث سے ملتا ہے، اس لیے یہ کہہ کر اجماع کی اہمیت کو نہیں گھٹایا جاسکتا ہے، کہ یہ تیسری چیز کہاں سے آئی ہے؟ اجماع کے دلائل سے قرآن وسنت کی نصوص بھری پڑی ہیں، کچھ آیات وروایات کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے:

قرآن میں ارشاد باری ہے: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ. وَ سَاءَتْ مَصِيْرًا (۱)

اسی طرح حدیث میں ہے: لَا تجتمع أمتي على الضلالة.

کہ میری امت کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔

(۱)سورہ نساء: ۱۱۵

آثارِ صحابہؓ

عقیدہ کے باب میں اہل سنت والجماعت کا اہم ترین ماخذ آثارِ صحابہؓ ہیں، صحابہ کرامؓ وہ مقدس جماعت ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا، یہ حضرات نبی کریم ﷺ کی تئیس سالہ محنتوں کا ثمرہ ہیں، یہ دین کی بنیاد اور امت مسلمہ کی پہلی کڑی ہیں، کتاب وسنت کی تبلیغ ہو یا اسلامی تہذیب وثقافت کی نشر واشاعت یا دینی خدمت کا کوئی اور گوشہ، تمام کے تمام اپنے وجود وبقا اور ترقی اور فروغ میں حضرات صحابہؓ کی مخلصانہ کوششوں کے رہین منت ہیں، عظمتِ صحابہؓ ایسا منصوص مسئلہ ہے جس کی بنیادیں کتاب وسنت کی سینکڑوں آیات وروایات پر قائم ہیں، اس لیے اسلامی عقائد کے باب میں حضرات صحابہؓ کی تشریحات کو بہت بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حضرات صحابہؓ نے اپنے فکر وعمل سے اسلام کی ایسی عظیم ترین خدمات انجام دیں کہ وہ خود معیارِ حق اور میزان عدل بن گئے، ان کی سیرت وکردار کو سامنے رکھ کر بعد والوں کے افکار ونظریات کا جائزہ لیا جائے گا۔ بعد والوں کو ان کے ترازو میں تولا جائے گا؛ لیکن بعد والوں کو یہ حق نہیں ہے کہ صحابہؓ کو اپنے اپنے ناقص پندار کے ترازو میں تولنا شروع کریں۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا، چناں چہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا بہت سے اختلافات دیکھے گا، اس لئے تم لوگوں پر لازم ہے کہ میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کا التزام کرو؛ اس کو دانتوں سے مضبوط تھامو، دین میں ایجاد کردہ نئی چیزوں سے گریز کرو؛ اس لئے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔(۱)

آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: ستارے آسمان کے لئے بچاؤ کا ذریعہ ہیں، جب تارے مٹ جائیں گے تو آسمان میں وہ چیز آجائے گی جس کا وعدہ کیا گیا ہے (قیامت)، میں اپنے صحابہؓ کے لیے ذریعہ امن ہوں، جب میں چلا جاؤں گا تو ان پر وہ حالتیں آئیں گی جن کا وعدہ کیا گیا ہے (یعنی اختلاف اور تفرقہ) اور میرے صحابہؓ میری امت کے لئے بچاؤ ہیں، جب میرے صحابہؓ چلے

(۱)ترمذی: کتاب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدعۃ، حدیث: ۲۶۷۶

جائیں گے تو میری امت میں وہ چیزیں آئیں گی جن کا وعدہ کیا گیا ہے (گمراہی شقاق و نفاق، بدعملی، بدعقیدگی وغیرہ)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ امت کے پاسبان اور ان کے طریقہ کی پیروی امت کے لیے راہِ نجات ہے۔

نبی کریم ﷺ نے صراطِ مستقیم کی وضاحت بھی ان الفاظ میں فرمائی ہے جن سے عقیدہ کے باب میں خاص طور سے صحابہ کرامؓ کے طریقہ کی پیروی لازم ہوجاتی ہے۔

آپ علیہ السلام نے فرقۂ ناجیہ کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا تھا: **ما انا علیه و اصحابی** کہ جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں، اس کی پیروی کرنے والے لوگ ہی راہ یاب ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم احادیث صحیحہ، اجماع امت اور آثارِ صحابہؓ، یہ چاروں عقیدۂ اہل سنت والجماعت کے بنیادی مآخذ ہیں۔ ان چاروں کے علاوہ عقیدہ کے باب میں کوئی پانچواں ماخذ نہیں۔

(۱) مسلم شریف: آثار فضائل الصحابہؓ، حدیث: ۲۰۷

اہل سنت والجماعت کی استنادی حیثیت

کسی بھی جماعت کی حقیقت اور تعریف میں اس کے نام کا بڑا دخل ہوتا ہے، نام ہی سے اس کی حیثیت اور اغراض کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ اہل سنت والجماعت یہ فرقہ ناجیہ کا لقب ہے، یہ لقب مصنوعی اور انسانی عقل کی ایجاد نہیں؛ بلکہ یہ لقب بھی منصوص ہے اور حدیث افتراق امت کا آخری جملہ **ما أنا علیه و أصحابی** میں اس کی طرف کافی اشارہ موجود ہے۔ حدیث سے پہلے ہمیں اہل السنّت والجماعت کا تجزیہ کرنا چاہئے، اہل سنت والجماعت دو لفظوں سے مرکب ہے۔

(۱) السنۃ (۲) والجماعۃ

سنت کا لغوی معنی ہے **الطریقة** اور مراد ہے قانون، دستور، طریق ہدایت اور صراطِ مستقیم؛ جب کہ الجماعۃ سے مراد ہے نفوس قدسیہ: نبی کریم ﷺ، آپؐ کے صحابہؓ اور ان کے طریقہ پر چلنے والی صلحائے امت کی جماعت، جن کا کام صراطِ مستقیم کی تشریح و وضاحت اور فکر و عمل سے اس کی پابندی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت شریعت اور رجال شریعت کا حسین امتزاج ہیں، اس میں کتاب و سنت کی بالادستی بھی ہے اور رجالِ شریعت جیسے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی تشریحات پر بھرپور اعتماد بھی۔ اس مختصر تجزیہ کے بعد حدیث کے الفاظ **ما أنا علیه و أصحابی** پر غور کرنا چاہئے۔

اس حدیث میں لفظ ''ما'' سے مراد قانون شریعت اور صراطِ مستقیم ہے اور ''**أنا و أصحابی**'' سے رجالِ شریعت مراد ہے اور انہیں رجال کو بعض دیگر روایات میں ''الجماعۃ'' الجماعۃ کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح لفظ ''السنۃ'' اور لفظ ''الجماعۃ'' دونوں ہی حدیث کے مدلول ہوئے اور انہی دونوں بنیادوں کو مضبوطی سے تھامنے والے حضرات اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''یہ لقب دو کلموں سے مرکب ہے، ایک ''السنۃ''، اور ایک ''الجماعۃ'' ان دونوں کے مجموعہ ہی سے ان کا مسلک بنتا ہے، تنہا کسی ایک کلمہ سے نہیں، السنۃ کے لفظ سے قانون، دستور، طریق ہدایت

اور صراطِ مستقیم کی طرف اشارہ ہے جس پر چلنے کا امت کو امر کیا گیا ہے۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ. (۱)

اور الجماعۃ کے لفظ سے ذواتِ قدسیہ، شخصیات مقدسہ اور صدق وصفا، رہنمایانِ طریقہ کی طرف اشارہ ہے، جن کی رہنمائی اور معیت وتربیت میں اس صراط مستقیم اور راہ تقویٰ پر چلنے اور اسے سمجھنے کا امر کیا گیا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ. (۲)(۳)

---

(۱) الانعام:۱۵۳

(۲) توبہ:۱۱۹

(۳) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، علمائے دیو بند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج، ص:۲۷

اہل سنت والجماعت کی امتیازی خصوصیات

اہل سنت والجماعت جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا امت کا سب سے منتخب طبقہ ہے جس نے پوری شریعت اسلامیہ کو مکمل توازن اور اعتدال کے ساتھ تھام رکھا ہے، یہ اسلامی شریعت کے سب سے بڑے ترجمان اور اسلامی افکار ونظریات، اسلامی عقائد واعمال اور اسلامی اقدار وروایات کے سب سے بڑے محافظ اور علمبردار ہوتے ہیں، اس جماعت کی بہت سی امتیازی خصوصیات ہیں، جن کا تذکرہ کتاب وسنت میں آیا ہے۔ ان خصوصیات کی روشنی میں ہر دور میں اس جماعت کو جانا پہچانا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اس جماعت کی کچھ اہم خصوصیات کا تذکرہ پیش ہے۔

(۱) اعتدالِ فکر ونظر

اعتدال فکر ونظر اسلامی شریعت کی سب سے بڑی خوبی ہے، اسی اعتدال نے اسلامی شریعت کو جامعیت عطا کی ہے، دین اسلام میں خالق کے حقوق بھی ہیں اور مخلوق کے بھی اور مخلوق میں انسانوں کے بھی حقوق ہیں اور جانوروں کے بھی۔

انسانوں میں اپنوں کے بھی حقوق ہیں اور غیروں کے بھی، دوستوں کے بھی حقوق ہیں اور دشمنوں کے بھی، غریبوں کے بھی اور رشتہ داروں کے بھی، رشتہ داروں میں والدین کے بھی، اولاد کے بھی اور بیوی اور شوہر کے بھی، اعمال کی روشنی میں دیکھا جائے تو دین اسلام عبادت بھی ہے، عادت بھی ہے، یہ اخلاق بھی ہے اور جہاد بھی، جذبۂ سخاوت بھی ہے اور قربانی بھی، اس میں معاملات بھی ہیں اور معاشرت بھی، قانون جرم وسزا بھی ہے اور اخلاق عفو درگزر بھی، عقائد کے باب میں دیکھا جائے تو اللہ رب العالمین کی تنہا عبادت اور حاکمیت کا اقرار بھی ہے اور نبی کریم ﷺ کی رسالت، محبت اور اطاعت کا یقین بھی، تمام انبیاء کرام کی حقانیت کا ایمان بھی ہے اور ہر دور کے مصلحین اور مجتہدین کی خدمات کا اعتراف بھی۔

اور خاص بات یہ ہے کہ عقائد، اعمال اور حقوق کی یہ جامعیت اعتدال کی بنیاد پر اس طرح

کھڑی ہے کہ کسی گوشہ میں نہ کوئی کمی ہے، نہ حقوق کی آپس میں کوئی مزاحمت ہے اور نہ ہی اعمال کا آپس میں کوئی ٹکراؤ۔ خوبصورت عمارت کی طرح ہر اینٹ اپنی جگہ لگی ہوئی ہے اور سب کے مجموعہ ہی سے اسلام کی پرشکوہ عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلام کے اسی اعتدال فکر ونظر اور اعتدال اعمال واخلاق کو اہل سنت والجماعت نے بڑی شدت سے اختیار کیا؛ یہاں تک کہ وہ خود اعتدال کی علامت بن گئے۔

اعتدال چوں کہ اسلامی شریعت کا نمایاں مظہر اور اہل سنت والجماعت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، اس لئے اعتدال پر تفصیلی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

اعتدال عربی لغت میں

اعتدال کے لئے عربی زبان میں لفظ ''وسطیة'' استعمال کیا جاتا ہے، وسطیة کے عربی زبان میں مختلف معانی ہیں جو قریب قریب ہیں۔

(۱) درمیانی چیز یعنی دو کناروں کے درمیان بیچ کا حصہ۔

کہتے ہیں: قبضتُ وسط الحبل (میں نے رسی کا درمیانہ حصہ پکڑا) ''لسان العرب''

(۲) اچھا اور بہتر:

کہا جاتا ہے هو وسيط فيهم (وہ لوگوں میں نمایاں شخصیت کا مالک ہے)۔

اسی طرح واسطة العقد، ہار کے لاکٹ کو کہتے ہیں جو ہار میں سب سے خوبصورت اور اچھا ہوتا ہے۔ (المنجد)

(۳) عادل اور پسندیدہ اخلاق والا۔ (لسان العرب)، اسی کو فقہاء ومحدثین اپنے الفاظ میں یوں کہتے ہیں: کبیرہ سے بچنے والا، صغیرہ پر اصرار نہ کرنے والا۔

(۴) عمدہ اور گھٹیا کے بیچ (الصحاح)

لفظ وسطیت قرآن میں:

قرآن کریم میں یہ لفظ پانچ مقامات پر مختلف صیغوں کے ساتھ آیا ہے:

(۱) حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى. (۱)

(۲) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا. (۲)

(۳) فَكَفَّارَتُهٗ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ. (۳)

(۴) فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا. (۴)

(۵) قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ. (۵)

سورۂ بقرہ آیت (۱۴۳) میں ''امة وسطا'' کی تفسیر میں مفسرین نے ''عدولاً'' اور ''خیاراً'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے عدالت اور عمدگی کا معنی مفہوم ہوتا ہے۔

سید قطب شہیدؒ نے لکھا ہے کہ: ''وسط میں اس کا بھی احتمال ہے کہ اس کے معنی بین بین، متوسط، اور درمیان کے ہوں؛ کیوں کہ دونوں ہی لفظ کے حقیقی معانی ہیں اور دونوں کو جمع کرلیا جائے تو یہ بھی خلاف مقصود نہیں؛ کیوں کہ درمیانہ ہی اچھا ہوتا ہے اور اچھا ہی درمیانہ ہوتا ہے۔ (۶)

قریب قریب یہی تفسیر دیگر آیتوں میں بھی منقول ہے۔

اعتدال اور وسطیت کا شرعی مفہوم

وسطیت امت مسلمہ کی وہ منفرد خصوصیت ہے جو اسے عدالت اور خیریت کا مقام عطا کرتی ہے۔

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ وسط وہ چیز ہے جو بہتر ہو اور افراط اور تفریط کے درمیان ہو۔

کسی بھی چیز کے اصلاً تین گوشے ہوسکتے ہیں۔

(۱) گوشۂ زیادتی (۲) گوشۂ نقص وکمی (۳) درمیانی گوشہ۔

گوشۂ زیادتی کو غلو اور افراط کہتے ہیں، گوشۂ نقص وکمی کو جفا اور تفریط کہتے ہیں اور گوشۂ درمیانی کو اعتدال یا شرعی اصطلاح میں صراطِ مستقیم کہتے ہیں، اس لیے اعتدال کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کے اضداد یعنی افراط وتفریط اور غلو وجفا کو سمجھنا ضروری ہے۔

---

(۱) سورۂ بقرہ: ۲۳۸ (۲) سورۂ بقرہ: ۱۴۳ (۳) المائدہ: ۸۹

(۴) سورۃ العادیات: ۵ (۵) سورۂ القلم: ۲۸ (۶) سید قطب شہیدؒ، فی ظلال القرآن: ج۲رص۹۷۱

(۱) غلو:

لغوی معنی حد سے گزر جانا۔ کہتے ہیں شرعی مفہوم بھی یہی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ غلو حد سے گزر جانے کا نام ہے اور حد سے گزرنا یہ ہے کہ کسی چیز کی تعریف وہجو میں بہت مبالغہ کیا جائے۔(۱)

غلو کا حکم

غلو شریعت میں ممنوع ہے، چاہے عقائد میں ہو یا اعمال میں۔

حرمت غلو کے بعض دلائل

(۱) آپ علیہ السلام نے تین مرتبہ فرمایا کہ **هلك المتنطعون** .(غلو کرنے والا ہلاک ہوگیا)(۲) متنطعون کا معنی ہے غالی، حد سے تجاوز کرنے والا۔

(۲) آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ: اے لوگو! دین کے باب میں تشدد اور غلو مت کرو، پھر اللہ تم پر سختی کرے گا۔ بعض اقوام نے اپنے اوپر سختی لازم کرلی تھی تو اللہ نے انہیں سخت احکام دے دیئے، کلیسا اور عبادت خانے میں ان کے کچھ بقیہ لوگ ہیں، پھر آپ ﷺ نے تلاوت فرمائی:

وَ رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ. (۳)

آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ: دین آسان ہے، کوئی شخص اس دین پر (کثرت عمل سے) غلبہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، مگر دین ہی غالب آجائے گا، لہٰذا اعتدال اختیار کرو، قریب قریب رہنے کی کوشش کرو اور خوش رہو، صبح وشام کی نمازیں اور کچھ تاریکی کی نماز سے مدد حاصل کرو۔(۴)

اس باب میں بے شمار آیات وروایات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلو ممنوع ہے۔

غلو کے اسباب اور علامتیں

(۱) اپنے اوپر یا دوسروں پر ایسی چیز لازم کردینا جو اللہ نے لازم نہیں کی۔

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم: ج۱ص۲۸۹
(۲) مسلم شریف: کتاب العلم، حدیث نمبر: ۲۶۷۰
(۳) ابوداؤد: کتاب الادب، حدیث نمبر: ۴۹۰۴
(۴) بخاری: کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۳۰

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد میں آئے تو دیکھا کہ دوستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے، آپ ﷺ نے پوچھا یہ رسی کیسی ہے؟ جواب ملا: یہ حضرت زینبؓ کی رسی ہے، جب وہ سست ہوجاتی ہیں تو اسی کے سہارے نماز پڑھتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے کھولو اور تم لوگ چستی کی حالت میں نماز پڑھا کرو اور جب سستی آئے تو سوجایا کرو۔(۱)

(۲) جو پاک چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں، انہیں بطور عبادت حرام کرلینا یا ضروری چیزوں کو چھوڑ دینا

غلو کی علامتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کی جائز کردہ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرلیا جائے یا ضروری چیزوں کو چھوڑ دیا جائے، اور اس کی بہترین مثال تین صحابہؓ والی حدیث ہے:

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ تین صحابہؓ آپ ﷺ کے گھر آئے اور آپ کی عبادت کے بارے میں پوچھا، جب بتایا گیا تو شاید انہوں نے کم سمجھا، پھر کہنے لگے ہمیں نبی کریم ﷺ سے کیا نسبت، آپ ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں، تو ان میں سے ایک نے کہا: میں رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا: میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔

آپ علیہ السلام آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں سب سے زیادہ متقی ہوں اور اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں اور سنو! جو شخص میری سنتوں سے اعراض کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔(۲)

(۳) عقیدت ومحبت کا غلو

یعنی شخصیات کی محبت میں انہیں ان کے صحیح مقام سے اوپر اٹھا دینا، جیسے: اماموں کے تعلق سے

(۱) بخاری شریف، حدیث: ۱۱۵۰
(۲) مسلم: کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۱۴۰۲

شیعوں کی عقیدت، نبی کریم ﷺ اور بزرگوں کے بارے میں بریلویوں کا غلو اور شیوخ طریقت کے بارے میں بعض اہل تصوف کا غلو۔

(۴) غلو کا تعلق صرف عمل سے نہیں، ترک سے بھی ہے

اسی لیے حلال چیزوں کو بغرض عبادت چھوڑ دینا غلو ہے، جیسے شادی، نیند، کھانے، پینے سے اجتناب وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ غلو کا تعلق عقائد سے بھی ہے اور اعمال سے بھی۔

افراط اور غلو مترادف ہیں۔

تفریط اور جفا

یہ غلو کی ضد ہے، تفریط کے لغوی معنی ہے ضائع کرنا، کوتاہی کرنا، چھوڑ دینا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ۔

دوسرا لفظ ہے ''جفا''، اس کے معنی ہیں دوری اختیار کرنا، بدسلوکی کرنا، ترش مزاج ہونا۔

تفریط اور جفا یہ دونوں کوتاہی اور حق سے دوری کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اسی لیے حرام کا ارتکاب اور فرائض وواجبات کو چھوڑنا یہ سب تفریط اور جفا کے دائرہ میں آتے ہیں اور یہ بھی اعتدال اور وسطیت کی ضد ہے۔ سابقہ تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ عمل جس میں غلو اور افراط ہو یا تفریط اور جفا ہو وہ راہِ اعتدال نہیں ہو سکتی۔

اعتدال

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ امت مسلمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقیدہ وعمل، اخلاق و نظریات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اعتدال پر قائم ہے، اعتدال کے دائرہ میں پوری شریعت آجاتی ہے؛ لیکن اعتدال کی کچھ نمایاں علامتیں بھی ہیں جن کے وجود سے اعتدال کا وجود ہوتا ہے، وہ علامتیں درج ذیل ہیں:

(۱) خیریت اور افضلیت

(۲) عدل وانصاف

(۳) آسانی کا وجود اور تنگی کا خاتمہ

(۴) حکمت وبصیرت

(۵) استقامت اور ثابت قدمی

(۹) جماؤ اور تغیر پذیری

یہ کچھ اوصاف ہیں جن کا پایا جانا اس امت میں ضروری ہے جو اعتدال کی دعویدار ہے، یہ صفات امت محمدیہ میں بدرجہ اتم موجود ہیں جو انہیں راہِ اعتدال پر کھڑی کرتی ہیں۔

(۱) افضلیت: امت محمدیہ افضل ہے: كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاس.(۱)

(۲) عدل: اُمَّةً وَّسَطًا کی تفسیر عَدُوْلاً سے کی گئی ہے۔

یہ امت عادل ہے، اسی لئے اس کو تمام اقوام کے لیے گواہ بنایا گیا، انصاف کا عالم یہ ہے کہ دشمنوں کے درمیان بھی عدل وانصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی.(۲)

(۳) آسانی اور تنگی کا خاتمہ

حرج کہتے ہیں، ہر اس عمل کو جو بدن یا نفس یا مال میں کسی زائد مشقت کا سبب ہو، اس دین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ نے اس میں تنگی اور مشقت نہیں رکھی ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ.(۳)

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ.(۴)

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا.(۵)

حدیث میں ہے: اَلدِّیْنُ یُسْرٌ. (۶)

یہ شریعت اسلامی کا سب سے بڑا امتیاز ہے کہ پوری شریعت میں انسان کی قدرت اور

---

(۱) آلِ عمران:۱۱۰ (۲) سورۃ المائدہ:۸ (۳) سورۃ الحج:۷۸

(۴) سورۃ البقرہ:۱۸۵ (۵) سورۃ البقرہ:۲۸۶ (۶) بخاری شریف، حدیث:۳۹

استطاعت کا خیال رکھا گیا ہے، پھر بھی کسی عمل میں انسان کو بہت دشواری ہو تو اللہ کی طرف سے یا تو وہ عمل ہی معاف ہو جاتا ہے یا اس کی ہیئت اور طریقۂ ادا میں تبدیلی کر دی جاتی ہے۔

نوٹ : دین کی آسانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت کے اعمال ترک کر دیے جائیں، نماز چھوڑ دی جائے یہ کہہ کر کہ دین آسان ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی نماز پڑھنی چاہئے کہ وہ آسان ہے، روزہ رکھنا چاہئے کہ وہ آسان ہے، یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہے کہ آسانی کا تعلق کسی خاص باب سے نہیں؛ بلکہ پوری شریعت سے ہے۔

(۴) حکمت وبصیرت

اعتدال کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں حکمت اور بصیرت سے فائدہ اٹھایا گیا ہو، حکمت کا مطلب ہے تدبیر اور دانشمندی کے ساتھ اقوال وافعال اور انداز معاشرت کو اختیار کرنا اور بصیرت کا مفہوم ہے۔شرح صدر اور یقین کی کیفیت۔

حکمت وبصیرت کے ساتھ اپنے کاز کو آگے بڑھانا امت محمدیہ کی خصوصیت ہے، قرآن میں ہے:

قُل هٰذِهٖ سَبِیۡلِیۡ اَدۡعُوۡا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیۡرَةٍ.(۱)

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ.(۲)

(۵) استقامت اور ثابت قدمی

اعتدال کی ایک علامت یہ ہے کہ اس میں استقامت اور پائیداری ہوتی ہے، ایک دو وقت کا جوش وخروش اور وقتی جذبات اعتدال کی علامت نہیں۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو دین پر استقامت کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ.(۳)

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا.(۴)

(۱) سورۂ یوسف:۱۰۸ (۲) سورۂ نحل:۱۲۵

(۳) سورۃ الشوریٰ:۱۵ (۴) سورۂ حٰم السجدۃ:۳۰

ایک صحابیؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے جسے مضبوطی سے پکڑ لوں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: قُلۡ اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسۡتَقِمۡ.

(کہو: میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر جم جاؤ)(۱)

وسطیت کے ذیل میں جن صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان ساری صفات کے تذکرے سے کتاب وسنت کی نصوص لبریز ہیں، ہاں اگر کسی ایک ہی جامع حدیث میں ان ساری صفات کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ تین صحابہؓ والی حدیث ہے۔

عن أنس بن مالكؓ قال: جاء ثلثة رهط إلى بيوت أزواج النبى ﷺ يسئلون عن عبادته، فلما أخبروا كأنهم تقالّوها، فقالوا: اين نحن من النبىؐ، وقد غفر الله له ماتقدم من ذنبه و ماتأخر. فقال أحدهم : أما أنا فاصلى أبداً. و قال آخر: انا أصوم الدهر ولا أفطر. قال آخر: انا اعتزل النساء فلا اتزوج أبداً.

فجاء رسول الله ﷺ فقال: إنى لأخشاكم لله و أتقاكم له. لكنى أصوم و أفطر، و أصلى و أرقد. و أتزوج النساء. فمن رغب عن سنتى فليس منى.(۲)

اس حدیث میں اعتدال کی تمام صفات نمایاں ہیں۔

(۱) خیریت وافضلیت، تو وہ إنی لأخشاكم لله میں موجود ہے۔

(۲) عدل وانصاف کا مفہوم، ہر ایک کو اس کا حق دینے سے واضح ہے، آپ علیہ السلام نے اس حدیث میں نفس کو بھی اس کا حق دیا اور روح کو بھی۔

(۳) آسانی اور تنگی کا خاتمہ، صحابہؓ نے جو چیزیں اپنے اوپر لازم کی تھیں، ظاہر ہے کہ وہ تنگ تھیں، آپ ﷺ نے آسان طریقہ بتایا۔

(۴) حکمت ودانش مندی، آپ ﷺ نے اپنی مثال دے کر بہت ہی حکمت کے ساتھ انہیں حسنِ عمل کی تلقین کی۔

(۵) استقامت، وہ حدیث کے آخری جملہ سے ثابت ہے: **من رغب عن سنتى فليس منى** کہ ایک مومن کے لئے لازم ہے کہ پوری زندگی راہِ سنت پر گامزن رہے اور یہی استقامت ہے

(۱) شعب الایمان، حدیث:۴۹۱۷ (۲) بخاری: کتاب الایمان، باب الترغیب فی النکاح، رقم ۵۰۶۳۰

اعتدال کی کچھ نمایاں مثالیں

اس میں دو باب ہیں، پہلا باب: اعتدال کی مثالیں عقائد میں، دوسرا باب: اعتدال کی مثالیں اعمال واخلاق میں۔

(۱) مثال اول توحید:

توحید کے باب میں دنیا کی قومیں افراط وتفریط کا شکار رہی ہیں، اکثر قومیں دنیاوی زندگی اور اس کے ظاہری زیب وزینت پر فدا رہی ہیں، انہوں نے خدا بھی تلاش کیے تو وہی جنہیں وہ دیکھ سکیں اور حسی طور پر اس کا مشاہدہ کرسکیں، عقائد کے باب میں یہ منہج تفریط ہے، اس کی واضح مثال ہر دور کے مشرکین اور خود قوم یہود ہیں۔ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی أرنا الله جهرةً ظاہر ہے یہ مطالبہ ان کی مادہ پرستی کا نتیجہ تھا، قوم یہود کا گزر ایک بت پرست قوم کے پاس سے ہوا تو یہودیوں نے حضرت موسیٰ سے درخواست کردی کہ اسی طرح کا خدا ہمیں بھی دو، اسی طرح جب سامری نے زیورات سے بچھڑا بنادیا تو چند لوگوں کے سوا پوری قوم بچھڑے کی عبادت میں لگ گئی، یہ اس قوم کی ظاہر پرستی کی انتہا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ: یہودیوں کو دنیوی زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہ موت کو سب سے زیادہ ناپسند کرنے والی قوم ہے۔

قرآن کریم میں ہے: وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ. (۱)

اسی پر بس نہیں، اس قوم نے اللہ جل جلالہٗ کی شان میں بھی بہت ساری گستاخیاں کر رکھی ہیں جیسے قَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ. (۲)

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ. (۳)

اور یہی حال اکثر مشرکین کا ہے کہ مادہ پرستی اور بت پرستی نے انہیں نور حق سے اندھا بنا رکھا ہے۔

اور دوسرا منہج افراط کا ہے، بعض قومیں جیسے نصاریٰ، روحانیت میں اتنا مبالغہ کرگئیں کہ انہوں نے بالکل رہبانیت اختیار کرلی، نہ جسم کا حق ادا کیا، نہ دنیا کا، نہ بیوی کا نہ بچوں کا، نہ رشتہ داروں

(۱) البقرۃ: ۹۵   (۲) المائدۃ: ۶۴   (۳) سورۃ التوبہ: ۳۰

کا اور نہ ہی مخلوق خدا کا، وہ صرف اور صرف عبادت الٰہی میں مشغول رہیں۔ قرآن نے کہا: وَ رَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهٖ. (۱)

یہ عقائد کے باب میں افراط اور حد سے گزر جانے کی مثال ہے۔ ان دونوں منہج کے درمیان اسلام کا معتدل نظام توحید ہے، جس میں توحید کی حفاظت پر مکمل زور دیے جانے کے ساتھ، دینی شخصیات کا بھی مکمل احترام ملحوظ رکھا گیا ہے، اور جس میں روحانیت کو بھی پورا حق دیا گیا اور انسانی ضروریات کو بھی۔ جس میں دین بھی ہے اور دنیا بھی۔ فرد کی مصلحت کا بھی لحاظ ہے اور معاشرہ کا لحاظ بھی۔

(۲) انبیائے کرام اور دینی شخصیات کا احترام

دنیا کے تمام مذاہب اور ان کے پیروکاروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب سے تعلق رکھنے والی شخصیات پر ایمان لاتے ہیں، ان کا حد درجہ احترام کرتے ہیں؛ لیکن اپنے مذہب سے تعلق نہ رکھنے والی شخصیات کا نہ وہ احترام کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات طعن وتشنیع اور توہین تک کرجاتے ہیں۔ قرآن نے قوموں کے ان رجحانات کا تذکرہ کیا ہے۔

ارشاد باری ہے:

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰی لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَّ هُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ. كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ. (۲)

اس آیت میں اسی کا تذکرہ ہے کہ کوئی بھی قوم، دوسری قوم کی کسی خوبی کا اعتراف نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ دوسری قوموں کے انبیاء اور مصلحین بھی گوارہ نہیں ہوئے۔ عیسائی، انبیاء بنی اسرائیل پر ایمان نہیں لاتے اور یہودی حضرت عیسیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور بھی دنیا کی مختلف قوموں کا حال یہی ہے کہ دوسرے مذاہب کے رہنماؤں پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے برخلاف اسلام کا فکری اعتدال یہ ہے کہ اس نے تمام انبیاء پر ایمان کو، ایمان کا ایک رکن قرار دیا ہے، تمام انبیاء پر اتری ہوئی کتابیں اور صحیفے پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ یہ اسلامی

(۱) سورۃ الحدید: ۲۷   (۲) سورۃ البقرہ: ۱۱۳

اسلامی عقیدہ کا اعتدال ہے۔

اعمال واخلاق میں اعتدال کی مثالیں

اسلام کا اعتدال اس کے ہر قانون اخلاق وعمل میں رکھنا ہے، کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) عبادت اور دنیوی ضرورت کا اجماع، جیسا کہ تین صحابہؓ کی حدیث سے معلوم ہوا۔

(۲) بیوی کے حقوق میں اعتدال قائم فرمایا، نہ اتنا مبالغہ کے دوسروں کا حق فوت ہو اور نہ اتنی تفریط کے بیوی معلقہ بن جائے، یہی حال اولاد کا بھی ہے۔

(۳) دشمنوں کے ساتھ اعتدال یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی انصاف کا معاملہ کیا جائے۔

(۴) کفار ومشرکین سے محبت وعقیدت حرام ہے، لیکن حسنِ سلوک اور مدارات کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اعتدال شریعت اسلامی کا لازمی عنصر ہے، جس کی روح تمام اسلامی قوانین میں جاری وساری ہے۔

(۲) اتباع سنت

اعتدال فکر ونظر کے بعد، عملی اعتبار سے اہل سنت والجماعت کی سب سے نمایاں اور واضح خصوصیت اتباع سنت ہے۔ سنت سے مراد نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال اور آپ ﷺ کی موجودگی میں صحابہؓ کے کیے گئے وہ اعمال وافعال ہیں جن پر آپ ﷺ نے نکیر نہیں فرمائی۔

نبی کریم ﷺ کی سنت شریعت اسلامی کا دوسرا سب سے بڑا اور مفصل سرچشمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قرآن کا شارح اور مفسر بنا کر بھیجا تھا۔ قرآن میں ہے: **وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ.** (۱)

نبی کریم ﷺ کی تشریحات، درحقیقت اللہ کی تشریحات ہیں، اس لیے علمائے امت حدیث کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ،إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى.**

اور ارشاد ہے: **ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ.** (۳)

اسی سنت کو قرآن کریم میں "الحکمۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم اور احادیث شریفہ کے متعدد نصوص میں، آپ علیہ السلام کی سنت پر ایمان لانے، ان پر عمل کرنے، ان کے سیکھنے سکھانے اور حفاظت کرنے کی بڑی ترغیب آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: **وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.** (۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيْعُو الرَّسُوْلَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ. فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ. (۵)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت ساری کی ساری جنت میں جائے گی، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے انکار کیا۔ صحابہؓ نے پوچھا: انکار کون کرتا ہے اے اللہ کے رسول؟ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: جس نے میری پیروی کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری

(۱) النحل: ۴۴ (۲) النجم: ۳،۴ (۳) القیامہ: ۱۹
(۴) سورۃ الحشر: ۷ (۵) سورۃ النساء: ۵۹

نافرمانی کی، اس نے انکار کیا۔(۱)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑیں ہیں، ان کے بعد تم گمراہ نہیں ہو سکتے۔ کتاب اللہ اور میری سنت۔(۲)

آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہیں روشن ملت پر چھوڑا ہے، جس میں رات بھی دن کی طرح روشن ہے، لہٰذا تم میری سنت اور میرے بعد برحق خلفائے راشدین کی نسبت کو لازم پکڑو، انہیں مضبوطی سے گرہ باندھ لو۔(۳)

کتاب وسنت کی مذکورہ بالا تصریحات سے سنت نبویہ کی اہمیت واضح ہے۔ درحقیقت اسلامی تہذیب اور اسلامی عقائد، اعمال و اخلاق، نیز اسلامی نظام حکومت و نظام معیشت اور دیگر تمام اسلامی شعبے اپنی تطبیق اور عملی رنگ میں سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے مرہون منت ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ سنت کا دامن بڑا وسیع ہے اور اس کے ذیل میں دنیا اور آخرت کے تمام ضروری مسائل داخل ہیں، اس لئے ہر دور میں صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ ومجتہدین اور بعد کے اربابِ عزیمت علماء ومصلحین نے سنت کو بڑی مضبوطی سے تھاما؛ بلکہ سنت کی پیروی ہی اہل حق اور باطل کے درمیان فرق اور تمیز کا معیار ٹھہرا۔ اتباع سنت کا معیار بڑا واضح اور محسوس معیار ہے؛ کیوں کہ سنت روزِ روشن کی طرح عیاں اور بیاں ہے اور ہر دور کے لوگوں کے افکار ونظریات بھی ہمارے سامنے ہیں۔ اتباع سنت کا معیار خود ساختہ معیار نہیں ہے، بلکہ یہ معیار خود کتاب وسنت کا تجویز کردہ ہے۔ سورۂ نساء آیت ۵۹ میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے، مراد کتاب وسنت ہے۔ معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کی حیثیت معیار اور حَکَم کی ہے۔ اسی کی روشنی میں حق اور باطل کا فیصلہ ہوگا۔

دوسری طرف نبی کریم ﷺ نے فرقۂ ناجیہ کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا: **ما أنا علیه و أصحابی** معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی سنت حق اور باطل کا معیار ہے۔

---

(۱) بخاری: عن ابی ہریرۃؓ، حدیث: ۷۲۸۰ (۲) رواہ الحاکم، عن ابی ہریرۃ فی المستدرک، حدیث: ۳۱۸

(۳) رواہ ابن ماجہ، عن العرباض بن ساریۃ، حدیث: ۴۳

صحابہ کی زندگی میں اتباع سنت کی چند مثالیں

حضرات صحابہ کرامؓ مدرسۂ نبوت کے پروردہ اور اللہ تعالیٰ کی منتخب جماعت تھے۔ ان حضرات نے اپنی پوری زندگی دین اسلامی کی حفاظت اور نبی کریم ﷺ کی پیروی میں گزاری، ان کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ تھی، اس لیے ان کی زندگی میں اتباع سنت کی کوئی خاص مثال تلاش کرنا ضروری نہیں۔ ان کے فضائل کے لئے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان سے اپنی رضامندی کا اعلان فرمایا۔ زبانِ نبوت نے ان کی تعریف کی۔ علماء امت نے ان کی عدالت پر اجماع کیا؛ لیکن ساری خوبیاں انہیں سنت کی اتباع اور بدعت سے اجتناب سے ہی ملی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا: وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (صحابہؓ نے دین میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں کی) ذیل میں ان کی اطاعت اور اتباع سنت کی چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) حدیث کعب ابن مالکؓ

یہ ایک لمبی حدیث ہے، جو حدیث کی مختلف کتابوں میں ذکر کی گئی ہے، واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حضور اکرم ﷺ کی ہمیشہ عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جس طرف لڑائی کا ارادہ ہوتا تھا اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا، بلکہ دوسری جانبوں کے احوال دریافت فرماتے تھے، مگر اس غزوۂ تبوک میں چوں کہ گرمی بھی شدید تھی اور سفر بھی دور کا تھا۔ ان کے علاوہ دشمنوں کی بھی بہت بڑی جماعت تھی، اس لئے صاف اعلان فرما دیا تھا تاکہ لوگ تیاری کر لیں۔ چناں چہ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت حضور ﷺ کے ساتھ ہوگئی کہ رجسٹر میں اُن کا نام بھی لکھنا دشوار تھا اور مجمع کی کثرت کی وجہ سے کوئی شخص اگر چھپنا چاہتا کہ میں نہ جاؤں، نہ پتہ چلے تو دشوار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی پھل بالکل پک رہے تھے۔ حضرت کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں بھی سامانِ سفر کی تیاری کا صبح ہی سے ارادہ کرتا، مگر شام ہو جاتی اور کسی قسم کی تیاری کی نوبت نہ آتی؛ لیکن میں اپنے دل میں خیال کرتا رہا کہ مجھے وسعت حاصل ہے، جب ارادہ پختہ کروں گا فوراً ہو جائے گا، حتی کہ حضور اقدس ﷺ روانہ بھی ہوگئے اور

مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ۔ مگر میرا سامانِ سفر تیار نہ ہوا۔ پھر بھی یہی خیال رہا کہ ایک دو روز میں تیار کر کے جا ملوں گا۔ اسی طرح آج کل پر ٹلتا رہا حتی کہ حضور ﷺ کے وہاں پہنچنے کا زمانہ تقریباً آ گیا۔ اس وقت میں نے کوشش بھی کی، مگر سامان نہ ہو سکا۔

اب میں جب مدینہ طیبہ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں تو صرف وہی لوگ ملتے ہیں جن کے اوپر نفاق کا بدنما داغ لگا ہوا تھا یا وہ معذور تھے اور حضور ﷺ نے بھی تبوک پہنچ کر دریافت فرمایا کہ کعب نظر نہیں پڑتے، کیا بات ہوئی؟ ایک صاحب نے کہا: یا رسول اللہ! اس کو مال و جمال کی اکڑ نے روکا۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ غلط کہا۔ ہم جہاں تک سمجھتے ہیں وہ بھلا آدمی ہے، مگر حضورِ اقدس ﷺ نے بالکل سکوت فرمایا اور کچھ نہیں بولے، حتی کہ چند روز میں میں نے واپسی کی خبر سنی تو مجھے رنج وغم سوار ہوا اور بڑا فکر ہوا۔ دل میں جھوٹے جھوٹے عذر آتے تھے کہ اس وقت کسی فرضی عذر سے حضور ﷺ کے غصہ سے جان بچا لوں، پھر کسی وقت معافی کی درخواست کر لوں اور اس بارے میں اپنے گھرانے کے ہر سمجھ دار سے مشورہ کرتا رہا، مگر جب مجھے معلوم ہو گیا کہ حضور ﷺ تشریف لے ہی آئے تو میرے دل نے فیصلہ کیا کہ بغیر سچ کے کوئی چیز نجات نہ دے گی اور میں نے سچ سچ عرض کرنے کی ٹھان ہی لی۔

حضور ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب سفر سے واپس لاتے تو اوّل مسجد میں تشریف لے جاتے اور دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتے اور وہاں تھوڑی دیر تشریف رکھتے کہ لوگوں سے ملاقات فرمائیں۔ چنانچہ حسب معمول حضور ﷺ تشریف فرما رہے اور منافق لوگ آ کر جھوٹے جھوٹے عذر کرتے اور قسمیں کھاتے رہے۔ حضور اکرم ﷺ ان کے ظاہرِ حال کو قبول فرماتے رہے اور باطن کو اللہ کے سپرد فرماتے رہے کہ اتنے میں میں بھی حاضر ہوا اور اسلام کیا۔ حضور ﷺ نے ناراضگی کے انداز میں تبسم فرمایا اور اعراض فرمایا۔ میں نے عرض کیا: یا نبی اللہ! آپ ﷺ نے اعراض فرمالیا۔ میں خدا کی قسم! نہ تو منافق ہوں نہ مجھے ایمان میں کچھ تردد ہے۔ ارشاد فرمایا کہ یہاں آ۔ میں قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تجھے کس چیز نے روکا؟ کیا تو نے اونٹنیاں نہیں خرید رکھی تھیں؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر میں کسی دنیا دار کے پاس اس وقت ہوتا تو مجھے یقین ہے

کہ میں اس کے غصہ سے معقول عذر کے ساتھ خلاصی پالیتا کہ مجھے بات کرنے کا سلیقہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے لیکن آپ کے متعلق معلوم ہے کہ اگر آج جھوٹ سے آپ کو راضی کر لوں تو قریب ہے کہ اللہ جل جلالہٗ مجھ سے ناراض ہوں گے اور آپ سے صاف صاف عرض کر دوں تو آپ کو غصہ آئے گا، لیکن قریب ہے کہ اللہ کی پاک ذات آپ کے عتاب کو زائل فرما دے گی۔ اس لئے سچ ہی عرض کرتا ہوں کہ واللہ! مجھے کوئی عذر نہیں تھا اور جیسا فارغ اور وسعت والا میں اس زمانہ میں تھا کسی زمانہ میں بھی اس سے پہلے نہیں ہوا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے سچ کہا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اٹھ جاؤ کہ تمہارا فیصلہ حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے۔

میں وہاں سے اٹھا تو میری قوم کے بہت سے لوگوں نے مجھے ملامت کی کہ تو نے اس سے پہلے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ اگر کوئی عذر کر کے حضور ﷺ سے استغفار کی درخواست کرتا تو حضور ﷺ کا استغفار تیرے لئے کافی تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی اور بھی ایسا شخص ہے جس کے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہو؟ لوگوں نے بتلایا کہ دو شخصوں کے ساتھ اور بھی یہی معاملہ ہوا کہ انہوں نے بھی یہی گفتگو کی جو تو نے کی اور یہی جواب ان کو ملا جو تجھ کو ملا۔ ایک ہلال بن امیہؓ، دوسرے مرارہ بن ربیعؓ۔ میں نے دیکھا کہ دو صالح شخص جو دونوں بدری ہیں وہ بھی میرے شریک حال ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ہم تینوں سے بولنے کی ممانعت بھی فرما دی کہ کوئی شخص ہم سے کلام نہ کرے۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ غصہ اسی پر آتا ہے جس سے تعلق ہوتا ہے اور تنبیہ اسی کو کی جاتی ہے جس میں اس کی اہلیت بھی ہو۔ جس میں اصلاح وصلاح کی قابلیت ہی نہ ہو اس کو تنبیہ ہی کون کرتا ہے۔ کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی ممانعت پر لوگوں نے ہم سے بولنا چھوڑ دیا اور ہم سے اجتناب کرنے لگے اور گویا دنیا ہی بدل گئی، حتی کہ زمین باوجود اپنی وسعت کے مجھے تنگ معلوم ہونے لگی۔ سارے لوگ اجنبی معلوم ہونے لگے۔ در و دیوار اوپرے بن گئے۔ مجھے سب سے زیادہ اس کا فکر تھا کہ میں اس حال میں مر گیا تو حضور ﷺ جنازے کی نماز بھی نہ پڑھیں گے اور خدانخواستہ حضور ﷺ کا وصال ہو گیا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا ہی رہوں گا، نہ مجھ سے کوئی کلام کرے گا، نہ میری نماز پڑھے گا کہ حضور ﷺ کے ارشاد کے خلاف کون کر سکتا ہے۔ غرض ہم لوگوں نے پچاس

دن اسی حال میں گذارے۔ میرے دونوں ساتھی تو شروع ہی سے گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں سب میں قوی تھا، چلتا پھرتا، بازار میں جاتا، نماز میں شریک ہوتا، مگر مجھ سے بات کوئی نہ کرتا۔ حضور ﷺ کی مجلس میں حاضر ہو کر سلام کرتا اور بہت غور سے خیال کرتا کہ حضور ﷺ کے لب مبارک جواب کے لئے ہلے یا نہیں۔ نماز کے بعد حضور ﷺ کے قریب ہی کھڑے ہو کر نماز پوری کرتا اور آنکھ چرا کر دیکھتا کہ حضور ﷺ مجھے دیکھتے بھی ہیں یا نہیں، جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو حضور ﷺ مجھے دیکھتے اور جب میں اِدھر متوجہ ہوتا تو حضور ﷺ منہ پھیر لیتے اور میری جانب سے اعراض فرما لیتے۔

غرض یہی حالات گذرتے رہے اور مسلمانوں کا بات چیت بند کرنا مجھ پر بہت ہی بھاری ہو گیا تو میں ابوقتادہ کی دیوار پر چڑھا۔ وہ میرے رشتہ کے چچازاد بھائی بھی تھے اور مجھ سے تعلقات بھی بہت ہی زیادہ تھے۔ میں نے اوپر چڑھ کر سلام کیا، انہوں نے سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے اُن کو قسم دے کر پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے؟ انہوں نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ میں نے دوبارہ قسم دی اور دریافت کیا: وہ پھر بھی چپ ہی رہے، میں نے تیسری مرتبہ پھر قسم دے کر پوچھا، انہوں نے کہا: اللہ جانے اور اس کا رسول۔ یہ کلمہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہاں سے لوٹ آیا۔

اسی دوران میں ایک مرتبہ مدینہ کے بازار میں جا رہا تھا کہ ایک قبطی کو جو نصرانی تھا اور ''شام'' سے مدینہ منورہ اپنا غلہ فروخت کرنے آیا تھا، یہ کہتے ہوئے سنا کہ کوئی کعب بن مالک کا پتہ بتا دو۔ لوگوں نے اس کو میری طرف اشارہ کر کے بتایا، وہ میرے پاس آیا اور غسان کے کافر بادشاہ کا خط مجھے لا کر دیا۔ اس میں لکھا ہوا تھا: ہمیں معلوم ہوا کہ تمہارے آقا نے تم پر ظلم کر رکھا ہے، تمہیں اللہ ذلت کی جگہ نہ رکھے اور نہ ضائع کرے، تم ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہاری مدد کریں گے (دنیا کا قاعدہ ہوتا ہے کہ کسی بڑے کی طرف سے اگر چھوٹوں کو تنبیہ ہوتی ہے تو ان کو بہکانے والے اور زیادہ کھونے کی کوشش کیا کرتے ہیں اور خیر خواہ بن کر اس قسم کے الفاظ سے اشتعال دلایا ہی کرتے ہیں)

کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ خط پڑھ کر اِنَّا لِلّٰہ پڑھی کہ میری حالت یہاں تک

پہنچ گئی کہ کافر بھی مجھ میں طمع کرنے لگے اور مجھے اسلام تک سے ہٹانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ یہ ایک اور مصیبت آئی اور اس خط کو لے جا کر میں نے ایک تنور میں پھونک دیا اور حضور اقدس ﷺ سے جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے اعراض کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی کہ کافر مجھ میں طمع کرنے لگے۔ اسی حالت میں چالیس روز ہم پر گذرے تھے کہ حضور ﷺ کا قاصد میرے پاس حضور کا یہ ارشاد لے کر آیا کہ اپنی بیوی کو بھی چھوڑ دو۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا منشا ہے؟ اس کو طلاق دیدوں؟ کہا: نہیں، بلکہ علیحدگی اختیار کر لو اور میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی ان ہی قاصد کی معرفت یہی حکم پہنچا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تو اپنے میکے چلی جا۔ جب تک اللہ تعالیٰ اس امر کا فیصلہ فرمائیں وہیں رہنا۔ ہلال ابن امیہؓ کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ ہلال بالکل بوڑھے شخص ہیں، کوئی خبر گیری کرنے والا نہ ہو گا تو ہلاک ہو جائیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں اور آپ کو گرانی نہ ہو تو میں کچھ کام کاج اُن کا کر دیا کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: مضائقہ نہیں، لیکن صحبت نہ کریں۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس چیز کی طرف تو ان کو میلان بھی نہیں، جس روز سے یہ واقعہ پیش آیا، آج تک ان کا وقت روتے ہی گذر رہا ہے۔ کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے بھی کہا گیا کہ ہلال کی طرح تو بھی اگر بیوی کی خدمت کی اجازت لے لے تو شاید مل جائے۔ میں نے کہا: وہ بوڑھے ہیں، میں جوان ہوں، نہ معلوم مجھے کیا جواب ملے، اس لئے میں جرأت نہیں کرتا۔

غرض اس حال میں دس روز اور گذرے کہ ہم سے بات چیت، میل جول، چھٹے ہوئے پورے پچاس دن ہو گئے۔ پچاسویں دن کی صبح کی نماز اپنے گھر کی چھت پر پڑھ کر میں نہایت غمگین بیٹھا ہوا تھا۔ زمین مجھ پر بالکل تنگ تھی اور زندگی دوبھر ہو رہی تھی کہ سَلع پہاڑ کی چوٹی پر سے ایک زور سے چلّانے والے نے آواز دی کہ کعب! خوشخبری ہو تم کو۔ میں اتنا ہی سن کر سجدے میں گر گیا اور خوشی کے مارے رونے لگا اور سمجھا کہ تنگی دور ہو گئی۔ حضور اقدس ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد ہماری معافی کا اعلان فرمایا۔ جس پر ایک شخص نے تو پہاڑ پر چڑھ کر زور سے آواز دی کہ وہ سب سے پہلے پہنچ گئی۔ اس کے بعد ایک صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگے ہوئے آئے، میں جو کپڑے پہن رہا تھا وہ نکال

کر بشارت دینے والے کی نذر کر دیئے۔ خدا کی قسم! ان دو کپڑوں کے سوا اور کوئی کپڑا اس وقت میری مِلک میں نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے دو کپڑے مانگے ہوئے پہنے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس طرح میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی خوشخبری لے کر لوگ گئے۔ میں جب مسجد نبوی میں حاضر ہوا تو وہ لوگ جو خدمتِ اقدس میں حاضر تھے، مجھے مبارک باد دینے کے لئے دوڑے اور سب سے پہلے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر مبارک باد دی اور مصافحہ کیا جو ہمیشہ ہی یادگار رہے گا۔ میں نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں جا کر سلام کیا تو چہرۂ انور کھل رہا تھا اور انوار خوشی کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی کے وقت میں چاند کی طرح سے چمکنے لگتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری توبہ کی تکمیل یہ ہے کہ میری جائیداد جو ہے وہ سب اللہ کے راستے میں صدقہ ہے (کہ یہ ثروت ہی اس مصیبت کا سبب بنی تھی) حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس میں تنگی ہوگی۔ کچھ حصہ اپنے پاس بھی رہنے دو۔ میں نے عرض کیا کہ بہتر ہے خیبر کا حصہ رہنے دیا جائے۔ مجھے سچ ہی نے نجات دی، اس لئے میں نے عہد کر لیا کہ ہمیشہ ہی سچ بولوں گا۔(۱)

اس حدیث سے اتباع سنت سے متعلق، چند اہم باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) اتباع سنت میں تمام صحابہؓ کا ان سے بات چیت نہ کرنا۔

(ب) چچازاد بھائی ابوقتادہ کی بے رخی۔

(ج) بیوی سے علیحدگی

(د) غسّانی بادشاہ کی طرف سے لالچ بھرے خط کو فتنہ سمجھ کر جلا دینا۔

(۲) شراب کی حرمت کا واقعہ

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میں ابوطلحہؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوعبیدہؓ، سہیلؓ ابن بیضاء اور ابودجانہؓ کو شراب پلا رہا تھا، یہاں تک کہ ان کو نشہ آ گیا، پھر میں نے سنا کہ ایک پکارنے والا پکار رہا ہے، لوگو! شراب حرام ہوگئی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں: یہ سن کر ہم میں سے نہ کوئی باہر گیا اور نہ کوئی باہر سے آیا؛ بلکہ ہم نے شراب گرا دی، مٹکے توڑ دیئے۔ بعض نے وضو کیا، بعض نے غسل کیا، ہم نے حضرت ام سلیمؓ

(۱) فضائلِ اعمال، ص: ۵۵-۶۰

کی خوشبو لگائی پھر مسجد پہنچے تو آپ علیہ السلام يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ. (الآیۃ) والی آیت تلاوت فرما رہے تھے۔(۱)

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان سنتوں پر بھی سختی سے عمل کرتے تھے، جنہیں عادت اور سنن زوائد کی قبیل سے سمجھا جاتا ہے۔ صحابہؓ کی زندگی میں اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں، پھر تابعین اور تبع تابعین اور ہر دور کے مجددین اور مصلحین کی زندگی میں اتباع سنت کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

سلف صالحین اور اتباع سنت

حضرات سلف بھی اتباع سنت میں، صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چلے، انہوں نے اس گراں مایہ سرمایہ کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا، حضرات سلف کی فہرست بہت بڑی ہے، ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر چند واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، واقعات کا احاطہ نہ مقصد اور نہ ہی ممکن۔

امام ابوحنیفہؒ اور اتباعِ سنت

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اتباع سنت کی بڑی دلیل ان کا وہ فقہی قاعدہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ کو سب سے پہلے قرآن میں تلاش کیا جائے گا، پھر حدیث میں تلاش کیا جائے گا، اگر حدیث میں نہ ملے تو اجماع امت اور اگر اجماع میں بھی نہ ہو تو قیاس صحیح کے ذریعہ مسئلہ مستنبط کیا جائے گا، یعنی نص کے ہوتے ہوئے رائے اور قیاس پر عمل کرنا امام ابوحنیفہ جائز اور صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔(۲)

امام شافعیؒ اور اتباع سنت

امام شافعیؒ کا مشہور قول ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔ امام ربیعؒ کہتے ہیں کہ: میں نے امام شافعیؒ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اگر میری کتاب میں خلاف سنت کوئی مسئلہ پاؤ تو سنت پر عمل کرو، میری بات چھوڑ دو۔

دورانِ درس ایک شخص نے امام شافعی علیہ الرحمہ سے پوچھا: اے ابوعبداللہ! کیا ہم اس حدیث پر عمل کریں۔

(۱) ابن کثیر، ج۳، ص: ۱۸۲

(۲) اعلام السلف: ج۲، ص ۷

امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب میں حدیث سناؤں اور اس پر عمل نہ کروں تو سمجھ لینا کہ میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔(۱)

امام اوزاعیؒ اور اتباع سنت

حضرت امام اوزاعیؒ نے اپنے شاگرد اسحاق فزاریؒ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اپنے آپ کو سنت پر جمادو اور وہاں کھڑے ہو جاؤ جہاں قوم یعنی صحابہؓ کھڑے تھے، وہی بات کہو جو صحابہؓ نے کہی، ان کاموں سے پرہیز کرو جن سے صحابہؓ نے پرہیز کیا اور اپنے سلف کے راستہ پر چلو، ایمان درست نہیں ہوتا مگر قول سے اور قول صحیح نہیں ہوتا ہے مگر عمل سے اور ایمان، قول وعمل صحیح نہیں ہوتے ہیں مگر حسنِ نیت اور سنت کی موافقت سے۔(۲)

الغرض ہر دور کے علماء و مصلحین کی شان یہ تھی کہ انہوں نے اپنے قول وعمل میں اور زندگی کے ہر شعبہ میں سنت کی پیروی کی۔

ردِ بدعات اتباع سنت کی دلیل ہے

سلفِ صالحین کی اتباع سنت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے بدعات کی تردید کی اور نہ صرف تردید؛ بلکہ قید وبند اور شہادت تک کی مشقتیں برداشت کیں، ان بدعات کا تعلق چاہے فکر ونظر سے ہو یا نظامِ حکومت سے یا عملی زندگی سے۔

حضرت امام مالکؒ نے ان لوگوں پر شدید تنقید کی، جو صفات باری میں بے جا تاویلیں کرتے ہیں۔ امام مالک کو ایک حدیث بیان کرنے سے منع کیا گیا، آپ نہیں مانے، آپ کو کوڑے لگائے گئے۔(۳)

خلافت عباسیہ کی بدانتظامی کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے منصب قضا قبول کرنے سے انکار کردیا، خلیفہ منصور نے اصرار کیا، آپ کا اصرار بھی بڑھتا گیا، نتیجتاً آپ کو قید کردیا گیا اور روزانہ کوڑے لگائے جاتے۔(۴)

(۱) اعلام السلف: ج۲، ص۷ (۲) اعلام السلف: ج۴، ص۸ (۳) ایضاً (۴) ایضاً

اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے دور میں فتنہ خلق قرآن نے سر ابھارا، آپ نے پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی، حکومت عباسیہ اس فتنہ سے متاثر ہو چکی تھی، خلیفہ مامون رشید اور اس کے بعد خلیفہ معتصم باللہ، معتزلہ کے عقائد سے متاثر ہو چکے تھے اور انہوں نے بزور شمشیر، علماء اور رعایا کو اس عقیدہ پر مجبور کرنا چاہا، اس نازک گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو کھڑا کیا، آپ نے معتزلہ کے بڑے بڑے علماء اور اس کی پشت پناہ حکومت عباسی کو دلیل سے مغلوب کردیا۔ اس سلسلہ میں حضرت الامام کو سخت تکلیفیں، آزمائشیں برداشت کرنی پڑیں، آپ پر کوڑے لگائے جاتے، آپ کو باندھ دیا جاتا، یہاں تک کہ آپ کے دونوں ہاتھ کندھے سے اتر گئے۔(۱)

اسی طرح بعد کے ادوار میں جب بھی کوئی بدعت کھڑی ہوئی علماء اہل سنت والجماعت نے ان بدعتوں کی تردید کے لیے سارا زور صرف کردیا اور بدعات کے خلاف یہ محاذ آرائی درحقیقت اتباع سنت اور تحفظ سنت کی غرض سے تھی۔

(۱) ابوبکر خلال، السنۃ، ج۱، ص۱۲

(۳) تجدید دین اور حفاظتِ دین

اہل سنت والجماعت کا تیسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ان سے احیائے دین اور تجدید دین کا کام لیا ہے۔

تجدید کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو اس کی پہلی حالت پر لوٹانا۔ ایک حدیث میں ہے تم اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہا کرو۔

صحابہؓ نے پوچھا: ہم اپنے ایمان کی تجدید کیسے کریں؟ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: **لا الٰہ الا اللّٰہ** کثرت سے پڑھا کرو۔(۱)

ظاہر ہے کہ **لا الٰہ الا اللّٰہ** کے ذریعہ ہی ایمان وجود میں آتا ہے اور اس کا بار بار تذکرہ کرنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے اور وہ پہلی اصلی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

اصطلاح میں تجدید دین کا مفہوم ہے: دین کو اس کی اصلی حالت پر لوٹانا، یعنی جس کیفیت پر دین، عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں تھا، اسی کیفیت پر اسے لوٹانے کی کوشش کرنا۔ دین میں پیدا ہونے والی نئی نئی بدعات اور منکرات کا ازالہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے احیاء کی کوشش کا نام تجدید دین ہے۔

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس علم کو بعد والوں میں سے ہر ایسے عادل لوگ حاصل کریں گے جو دین سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹے لوگوں کی من گھڑت باتیں اور جاہلوں کی باطل تاویلوں کو دور کرتے رہیں گے۔(۲)

یہ حدیث خبر کی شکل میں ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو یہ محض ایک خبر نہیں، بلکہ معناً انشاء ہے اور اہل سنت والجماعت کی ذہنی تربیت اور احساس ذمہ داری کا بیان ہے۔ یعنی امت مسلمہ کو اس ذمہ داری کے لیے تیار رہنا چاہئے۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے نفع کے واسطے ہر سو برس پر ایک شخص بھیجتا ہے جو اس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔(۳)

---

(۱) مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۸۴۹۳ (۲) سنن کبری، ج ۱۰، ص ۲۰۹ (۳) ابوداؤد شریف، حدیث نمبر: ۴۲۹۱

اس حدیث کے تحت محدثین اور علمائے امت نے بڑی طویل گفتگو کی ہے اور تجدید کے شرائط، مجدد کی صفات اور ہر دور میں مجدد دین کی تعیین کی کوشش کی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شانِ مجددیت کے حاملین علماء کی تعداد ہر دور میں کم رہی ہے؛ لیکن بفضل اللہ یہ سلسلۂ تجدید، امت محمدیہ میں ہر دور میں باقی ہے۔ اہل سنت والجماعت کی خصوصیات میں احیائے دین اور تجدید دین کا جو مفہوم یہاں پر ہمارے ذہن میں ہے اس کا حاصل بس یہ ہے کہ ہر دور میں علمائے اہل سنت والجماعت نے دین میں در آنے والی بدعات اور خرافات کی تردید کی، چھوٹی اور بڑی سنتوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی، علم دین کا چراغ روشن رکھا، دین کی بنیادوں پر ان کی محنتیں جاری رہیں، بدعقیدوں سے مناظرے کیے، فساق وفجار کی اصلاح کی کوششیں کی اور اس عظیم کام میں ہر شخص نے اپنی حیثیت اور صلاحیت کے بقدر حصہ لیا۔ اس طرح تجدید دین کے لیے کام کرنے والوں کی تعداد ہر دور میں سینکڑوں میں نہیں؛ بلکہ ہزاروں میں پہنچ جاتی ہے۔

تجدید دین کا دائرہ کار

تجدید دین جو دراصل احیائے اسلام کا دوسرا نام ہے اور جسے اہل سنت والجماعت کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے، اس کے دائرہ کی تعیین ایک ضروری امر ہے۔

کچھ لوگوں نے تجدید کے نام پر دین کی بنیادوں اور اصولوں پر حملہ کو روا رکھا ہے، جو اصل دین کی بنیادوں پر حملہ ہے نہ کہ دین کا احیاء۔

تجدید دین کے دائرہ کار کی تعیین میں وہ حدیث بہت معاون ہے جس میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: اس عمل کو ہر پہلے والوں سے بعد والے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے، جو دین سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی من گھڑت باتیں اور جاہلوں کی باطل تاویلوں کو دور کرتے رہیں گے۔

اس حدیث میں تین الفاظ بہت اہم ہیں، جو دراصل ہر دور کی باطل جماعتوں کی بنیاد ہیں۔

وہ تین الفاظ یہ ہیں: تاویل، تحریف، انتحال

اسلامی فرقوں اور جماعتوں کی تاریخ سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ یہی تین چیزیں ہر

دور میں باطل جماعتوں کا ہتھیار رہی ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ ان تین الفاظ کی مختصر وضاحت ہو۔

(۱) تحریف

لغوی معنی: بدلنا، شرعی معنی: نصوص شرعیہ کے ظاہری الفاظ میں کمی زیادتی، یا نصوص کے معانی اور مفاہیم کی تعیین میں سلف صالحین کی تشریحات پر اعتماد نہ کرنا، یا حلال کو حرام کرنا، یا اس کے برعکس، یا دین میں کسی نئی چیز کا اضافہ کر دینا، یا کسی حکم شرعی کو اس کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دینا۔ یہ سب تحریفات کا حصہ ہیں اور یہی وہ خلل ہے جو باطل افکار ونظریات کا لازم عنصر ہے۔ اسلامی جماعتوں میں شیعہ، قرآن کی تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں اور جب کہ معنوی تحریف ہر دور کے جدت پسندوں اور باطل فرقوں میں موجود ہے۔

(۲) انتحال

لفظی ترجمہ جھوٹی نسبت کرنا۔ شرعی مفہوم: دین کی طرف ایسی غلط چیزوں کا انتساب جو دین میں نہیں ہیں، جیسے جھوٹی حدیثیں گڑھنا اور نئے نئے مسئلے ایجاد کرنا یا دین کی کسی ثابت شدہ چیز کو غلط طریقہ سے دین کی طرف منسوب کرنا۔

(۳) تاویل

لغوی معنی: لفظ کو اسی کے ظاہری معنی سے ہٹا دینا لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹانا، اگر کسی شرعی دلیل کی روشنی میں ہے تو یہ تفسیر ہے اور اگر خواہشات نفس کی پیروی میں ہے یا جماعتی عصبیت میں ہے تو یہ تاویل فاسد اور تحریف ہے۔ حدیث میں تاویل باطل ہی مراد ہے۔ اسلام میں جو نئے نئے فرقے وجود میں آئے، ایسا نہیں تھا کہ ان کے سامنے کتاب وسنت نہیں تھی؛ بلکہ انہوں نے کتاب وسنت کی تشریحات، اپنے افکار وخیالات کے مطابق کر دی، جیسے خوارج نے "إنِ الْحُکْمُ إلاَّ لِلّٰہِ" کی غلط تفسیر کر کے حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے فیصلۂ تحکیم کو مسترد کر دیا۔ شیعوں نے "من کنتُ مولاہ فعلیّ مولاہ" کی غلط تاویل کی۔

فرقۂ باطنیہ نے "لکل آیة ظھر و بطن" کی غلط تاویل کی۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت نے خاتم

النبیین کی تاویلیں اپنی خواہشات کے مطابق کیں اور یہی سب کچھ ہر دور کے باطل فرقوں نے کیا۔

تو اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تجدید دین کی بنیاد یہی ہے کہ دین کو ہر طرح کی آلائشوں سے پاک کر دیا جائے، امت میں دینی روح پیدا کی جائے، دین کی بنیاد پر اتنی محنت ہو کہ وہ بے غبار ہو جائے اور تحریفات، باطل تاویلات اور من گھڑت باتوں کا مکمل طور سے سد باب کر دیا جائے۔ تجدید دین کی اسی ذمہ داری کو بعض علماء نے احیائے سنت اور رد بدعات سے ذکر کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تجدید دین کا کام کرنے کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں:

(۱) اس فریضہ کو انجام دینے والا صحیح العقیدہ ہو اور حسنِ اعمال وحسنِ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو؛ کیوں کہ جس کا عقیدہ خود خراب ہے وہ عقائد واعمال کی اصلاح کیسے کر سکتا ہے؟

(۲) گہرا علم: اس لئے کہ تحریف، تاویل اور انتحال اور باطل فرقوں کے من گھڑت دلائل کی تردید، علم ہی کے راستہ سے ہو سکتی ہے۔ جاہل آدمی خود ان چیزوں کا شکار ہو جائے گا۔

(۴) کتاب اللہ و رجال اللہ کو مضبوطی اور اعتدال کے ساتھ پکڑنا

علمائے اہل سنت والجماعت کی چوتھی خصوصیت کتاب اللہ اور رجال اللہ کو ایک ساتھ مضبوطی سے تھامنا ہے، اور وہ بھی اس شان سے کہ اعتدال کی تمام خصوصیات اس میں جمع رہیں، کسی کا حق، دوسرے کی زد میں نہ آئے۔

اہل سنت والجماعت کا مسلک اعتدال، توسط اور جامعیت کا حسین مجموعہ ہے۔ اس کی راہ افراط وتفریط سے بالکل الگ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کی دونوں اہم بنیادوں کو تھام رکھا ہے، پہلی بنیاد ہے کتاب اللہ اور دوسری بنیاد ہے رجال اللہ۔

کتاب اللہ سے مراد اسلامی شریعت کے قوانین اور دساتیر ہیں، جن میں حدیث اور فقہ بھی آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی قوم بغیر اصول وضوابط کے متمدن اور ترقی یافتہ نہیں ہوسکتی۔ اسلامی اصول جسے اللہ نے پوری دنیا کی ہدایت کا منشور بنا کر بھیجا ہے وہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی ہے۔

دوسری بنیاد جو اہل سنت والجماعت کی فکری عناصر کا لازمی جزء ہے، وہ ہے رجال اللہ۔

رجال اللہ سے مراد سرور کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین اور صالحین امت ہیں، یعنی وہ شخصیات جن کی رہنمائی اور معیت میں صراطِ مستقیم کو سمجھنا اور اس پر چلنا آسان ہوجاتا ہے۔

قوموں کی تاریخ، امم سابقہ کی کہانیاں اور امت مسلمہ کے متعدد فرقوں کے تجربے اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ جس فرقہ نے ان دونوں بنیادوں کو ایک ساتھ اختیار نہیں کیا، ضلالت وگمراہی ان کا مقدر بن کے رہی۔

سابقہ قوموں میں کتاب اللہ اور رجال اللہ سے انحراف کی مثالیں

کتاب اللہ اور رجال اللہ دین کی دو بنیادیں ہیں، ان دونوں کو پورے اعتدال کے ساتھ

تھامنے کا نام ہی صراطِ مستقیم ہے اور ان دونوں کو یا کسی ایک کو چھوڑ دینے سے ہی ضلالت وگمراہی کا دروازہ کھلتا ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کی عقلاً چار صورتیں ممکن ہیں:

(۱) ان دونوں بنیادوں کو جذبۂ ایمانی سے مانا جائے۔

(۲) دونوں بنیادوں سے ایک ساتھ انحراف کیا جائے۔

(۳) کتاب خداوندی کو اختیار کیا جائے اور مربی شخصیات سے رابطہ منقطع کرلیا جائے۔

(۴) شخصیتوں کے ساتھ تعلق کا اظہار کیا جائے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

پہلی صورت ہر دور میں اہل حق کی رہی ہے اور یہی اسلامی فرقوں کے درمیان اہل سنت والجماعت کا امتیاز ہے کہ انہوں نے قانون شریعت (کتاب وسنت) کو بڑی مضبوطی سے تھاما اور رجال شریعت (نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اور ہر دور کے صلحاء امت) کو فرق مراتب کے ساتھ اختیار کیا۔ انہیں اپنا نمونہ بنایا۔

اور بعد کی تینوں صورتیں گمراہ لوگوں کا طریقہ رہی ہیں۔ مثلاً: قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیمؑ، قوم شعیبؑ، قوم فرعون، ان اقوام نے کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں کو ایک ساتھ ٹھکرا دیا۔

قوم نوح نے نوح علیہ السلام کو اپنے جیسا بشر کہا: قرآن میں ہے مَا نَرَاكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (۱)

اور ان کی تکذیب کی كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ (۲)

ان کے کلام کو سن کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے۔ الغرض نبی کی ذات اور قانون خداوندی دونوں کو چھوڑ دیا۔ اللہ نے طوفان سے ہلاک کردیا۔

اسی طرح قرآن نے ان تمام اقوام کے بارے میں کہا:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ. (۳) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ. (۴)

كَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِيْنَ. (۵) كَذَّبَ اَصْحَابُ الْاَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ. (۶)

---

(۱) سورۂ ہود: ۲۷ (۲) الشعراء: ۱۰۵ (۳) الشعراء: ۱۶۰

(۴) الشعراء: ۱۴۱ (۵) الشعراء: ۱۲۳ (۶) الشعراء: ۱۷۶

فرعون اوراس کی قبطی قوم نے حضرت موسیٰ کو جادوگر کہا: إنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ (۱)

اور آپ کے معجزات کو جادو، مَا هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى. (۲)

بالآخر یہ ساری قومیں عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوئیں۔قرآن کریم نے ان قوموں کے ہولناک دنیوی عذاب کا تذکرہ متعدد مقامات پر بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔یہ قومیں وہ تھیں جنہوں نے قانون خداوندی اور دینی شخصیات دونوں سے رشتہ توڑ لیا۔

امم سابقہ میں دو قومیں ایسی ہوئیں جنہوں نے دین کی بنیادوں میں سے ایک کو اختیار کیا اور دوسرے سے کٹ گئی۔

وہ دونوں قومیں ''یہود ونصاریٰ'' ہیں۔

یہود نے قانون حق کو اختیار کیا اور شخصیات سے اپنا رشتہ توڑ لیا، یہود کو توریت جیسی مقدس کتاب دی گئی اور اس دور میں انہیں سب سے افضل امت قرار دیا گیا؛ لیکن وہ علمی غرور میں مبتلا ہوگیے۔وہ سمجھنے لگے کہ جب ہمارے پاس کتابِ الٰہی توریت ہے اور ہم صاحب عقل وفہم ہیں تو ہمیں اب کسی اور شخص کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے۔اس لیے بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد جتنے پیغمبر آئے قوم یہود نے یا تو ان کی تکذیب کی یا انہیں قتل کرڈالا۔قرآن کریم میں ارشاد باری ہے: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ. (۳)

وہ انبیاء کی بات سن کر کہتے تھے ''سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا'' اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت ومسکنت لازم کردی، وہ مغضوب علیہم قرار دیئے گئے۔

دوسری طرف قوم نصاریٰ نے شخصیات کو اختیار کیا اور قانون خداوندی سے روگردانی کی۔اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے انجیل عطا کی اور اس میں فقہی احکام سے زیادہ اصلاح باطن اور تزکیہ اخلاق کے احکام رکھے؛ تاکہ یہ قوم عملی بن سکے اور تربیت کے لئے حضرت عیسیٰؑ جیسی عظیم شخصیت عطا کی۔

انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طریقہ کو اپنایا اور مقدس جماعت حواریین کی تیار ہوئی؛

(۱) الاعراف:۱۰۹ (۲) القصص:۳۶ (۳) البقرہ:۸۷

لیکن نسلاً بعد نسلٍ اس قوم میں علم ومعرفت کی کمی ہوتی رہی، البتہ دینی شخصیات اور مربیوں کی عقیدت وعظمت جوں کی توں رہی اور رفتہ رفتہ یہ قوم شخصیت پرستی میں مبتلا ہوگئی۔اس لیے ان کا سارا دین رسم ورواج کا مجموعہ ہوگیا، عملی تربیت کے لئے جو کتاب نازل کی گئی تھی وہ سامنے نہ رہی، تو انہوں نے عمل کے لئے نیا راستہ رہبانیت کا اختیار کیا۔قرآن نے کہا: وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (الآیۃ) پھر شخصیت پرستی نے انہیں شرک کے مقام تک پہنچادیا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا؛ بلکہ خدا سمجھ بیٹھے، اپنے راہبوں کو مقام ربوبیت پر فائز کردیا، احبار ورہبان جن چیزوں کو حرام کرتے انہیں حرام اور جن کو وہ حلال کہتے یہ حلال سمجھتے۔قرآن میں ہے: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. (التوبۃ:۳۱) اور یہ قوم ''الضالین'' کا مصداق ٹھہری۔

اس اصول کے دلائل

قانون خداوندی اور دینی شخصیات کو ایک ساتھ مضبوطی سے تھامے رہنے کی تاکید قرآن کریم میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ذیل میں دونوں کے دلائل الگ الگ پیش کیے جاتے ہیں۔

کتاب اللہ کو اختیار کرنے کے دلائل

کتاب اللہ سے مراد قانون خداوندی ہے، جس میں قرآن اور حدیث دونوں شامل ہیں۔
قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(۱) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا. (۱)

حدیث میں حبل اللہ کی تفسیر قرآن سے کی گئی ہے۔

(۲) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ. هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. (۲)

(۳) حدیث شریف میں ہے: تَرَكْتُ فيكم أمرين لن تضلّوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله و (سنتي) سنة رسوله. (۳)

(۱) آل عمران:۱۰۳ (۲) البقرہ:۲
(۳) رواہ مالک فی الموطا:۱۵۹۴

دینی شخصیات کی اتباع کے دلائل

(۱)مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا. (۱)

(۲)وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہ. (۲)

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ.(۳)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ. صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ.(۴)

ان آیتوں میں غور کیا جائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

(۱)اتباع رسول کی فرضیت (۲)اولی الامر کی پیروی۔

(۳)منعم علیہم کے راستہ پر چلنے کی تلقین۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ پر منعم علیہم کی تعیین کی ہے کہ یہ چار افراد ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

اس امت کا پہلا طبقہ یعنی صحابہ کرامؓ، اولوالامر، صدیقین، شہداء اور صالحین کا سب سے پہلا مصداق ہے، اسی طرح ان کے بعد ہر دور کے صالحین امت جنہوں نے اتباع سنت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، وہ بھی اس میں بلاشبہ داخل ہیں۔

حدیث میں فرقہ ناجیہ کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا: **ما أنا علیہ و أصحابی.** پہلے گزر چکا ہے کہ "ما" سے مراد قانونِ خداوندی اور "اَنَا وَ اَصْحَابِی" سے مراد دینی شخصیات ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **عَلیکم بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ.** (۵)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مشہور قول: **من کان مستنًّا فلیستن بمن قد مات، فإن الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ، اولٰئك أصحاب محمد، صلی اللّٰہ علیہ وسلم، کانوا أفضل ھذہ الأمۃ، ابرّھا قلوباً و أعمقھا علماً و اقلھا تکلفاً. اختارھم اللّٰہ لصحبۃ**

(۱)حشر:۷ (۲)نساء:۶۰ (۳)نساء:۵۹ (۴)الفاتحہ:۵-۶

(۵)شرح معانی الاثار، حدیث:۱۹۹

نبیہ و لإقامۃ دینہ. فاعرفوا لھم فضلھم. واتبعوھم علیٰ آثارھم و تمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم و سیرھم، فإنھم کانوا علی الھدی المستقیم. (۱)

خود اہل سنت والجماعت کا لقب بھی اسی جامعیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سنت سے مراد قانون خداوندی اور جماعت سے مراد دینی شخصیات ہیں۔

(۱)مشکوۃ: کتاب الایمان، حدیث:۱۹۳

(۵) دفاع زیغ وضلالت

اہل سنت والجماعت کی خصوصیات کے ذیل میں، دفاع زیغ وضلالت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔
نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ دین حق کو ادیان باطلہ پر غلبہ ہو جائے، ہدایت کی روشنی، کفرو ضلالت کی تاریکی پر غالب آئے اور اس مقصد کے لئے جہاں مثبت انداز میں دعوت وتبلیغ کی ضرورت ہے، وہیں باطل افکارونظریات کی تردید بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم میں جہاں حکمت وبصیرت کے ساتھ دعوت کا تذکرہ ہے، وہیں اچھے طریقہ سے باطل نظریات کی تردید کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَن. (۱)

وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. (۲)

لیکن اگر کفار دعوت اسلامی کی راہ میں حائل ہو جائیں، اسلامی روشنی سے نہ خود فائدہ اٹھائیں اور نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے دیں تو اس وقت ان کے خلاف تلوار اٹھانا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور ایسے موقع پر جہاد افضل ترین عمل قرار پاتا ہے۔ قرآن میں ہے: قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ. (۳)

دفاع کی دونوں صورتیں یعنی قولی دفاع، اور جنگی دفاع اہل سنت والجماعت کی ہر دور میں ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ چنانچہ عہد نبویؐ سے لے کر بعد کے تمام ادوار میں، جب بھی کوئی داخلی یا خارجی فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تو اہل سنت والجماعت کے نمائندہ حضرات نے پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا، اسلام کی تاریخ فتنوں اور آزمائشوں سے لبریز ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ارباب دعوت و عزیمت، داعیانِ اسلام اور جری وبے باک مجاہدین کی تاریخیں بھی روشن ہیں۔

طائفۂ منصورہ والی حدیث میں قتال کا تذکرہ طائفہ منصورہ کی اہم خصوصیت کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس لئے جہاد اور دفاع، اہل سنت والجماعت کا ایک نمایاں وصف قرار پاتا ہے۔

---

(۱) النحل:۱۲۵ (۲) العنکبوت:۴۶ (۳) البقرہ:۱۹۳

اہل سنت والجماعت کے کچھ اہم بنیادی نظریات

اس عنوان کے تحت ہمیں اہل سنت والجماعت کے افکارونظریات کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ اہم اہم ابواب سے متعلق اہل سنت والجماعت کے ان اصول اور اعتبارات کو جاننا ہے جو افکارونظریات کی بنیاد ہیں۔ اس باب میں ہم تین بنیادی موضوعات پر مختصر گفتگو کریں گے۔

(۱) عقیدہ (۲) فقہ (۳) تصوف

حاصل کلام یہ ہے کہ شریعت عقائد اور اعمال کا مجموعہ ہے، پھر اعمال دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء سے ہے، دوسرے وہ جن کا تعلق باطنی احوال وکیفیات سے ہے، جیسے: ایثار، سخاوت، زہد، تقوی، اور حسن اخلاق کی تمام چیزیں، اسی طرح کینہ، حسد، بخل، بغض، حب دنیا، اور برے اخلاق کی تمام چیزیں۔

عقائد سے متعلق گفتگو علم العقیدہ والکلام میں ہوتی ہے، اور ظاہری اعمال سے متعلق تفصیلی کلام، فقہ اسلامی کا موضوع ہے؛ جبکہ باطنی احوال واخلاق کی اصلاح، یہ علم تصوف کا موضوع ہے۔

اس لیے مناسب ہے کہ شریعت کی ان تینوں بنیادی چیزوں کے تعلق سے اہل سنت والجماعت کا نقطۂ نظر واضح کیا جائے، تاکہ ان موضوعات کے بارے میں تفصیلی خاکہ بنانا ہمارے لیے آسان ہو۔

(۱) عقیدہ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا موقف

اسلامی شریعت میں عقائد کی بڑی اہمیت ہے۔ عقیدہ کی صحت کا نام ہی ایمان ہے اور اسی پر اعمال کی قبولیت کا دارومدار ہے، عقیدہ کے باب میں دو بنیادی نظریے ہیں۔

پہلا نظریہ سلف کا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو کچھ کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ میں اسلامی عقائد کا ذکر آیا ہے، انہیں بے چوں و چرا قبول کرلیا جائے، اس میں انسانی عقل کو کچھ دخل نہ دیا جائے، انسانی عقل میں آجائے تو بہت خوب، ورنہ بلا عقلی ادراک کے ہی اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی کیفیات وتشریحات اللہ کے سپرد کردی جائیں، چنانچہ سلف سے اگر کسی اسلامی عقیدہ کے

بارے میں پوچھا جاتا تو وہ قرآن کریم کی کسی آیت کا یا کسی حدیث کا پڑھ دینا کافی سمجھتے اور یہی نظریہ اسلام کے دورِ اوّل میں رائج تھا۔

دوسرا نظریہ خلف کا ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب اسلام جزیرۃ العرب سے باہر نکلا اور عجمی ممالک میں اسلام پھیلا تو عجمی اقوام پہلے ہی سے توہم پرست، قیل وقال اور لفظی موشگافیوں کی عادی تھیں، انہوں نے اسلام کے صاف صاف عقائد کو بعینہٖ قبول کرنے کے بجائے عقلی سوالات شروع کر دیئے۔ اب ظاہر ہے کہ سلامتیٔ عقل ہر انسان کو نصیب نہیں، اس لئے اسلامی عقائد کے نام سے غلط افکار ونظریات نے پنپنا شروع کیا۔

دوسری طرف عباسی خلیفہ مامون رشید نے یونان کی فلسفیانہ کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا، بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور اس کے ذریعہ عراق اور دیگر ممالک میں بڑے پیمانے پر عقلی علوم کی اشاعت ہوئی۔ اس کا ایک غلط نتیجہ یہ ہوا کہ عقائد میں، بالخصوص الٰہیات میں یونانیوں کی وبا، عالم اسلام میں پھیل گئی، ہر مسئلہ کو عقلی دلائل سے پرکھنا، اس دور کا فیشن بن گیا اور الٰہیات سے متعلق سوالات کی کثرت ہوگئی، اس وقت متعدد اہل علم۔ جن کی نیتوں میں شبہ نہیں۔ اسلامی عقائد کے تحفظ کے لئے کوشاں تھے؛ لیکن عقل اور نقل کو جمع کرنا انتہائی دقیق کام ہے، اس میں انسان کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ، توفیق خداوندی کا بہت بڑا دخل ہے، اس لئے بہت سے اہل علم جن کی صلاحیتوں اور نیتوں میں شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس میدان میں پھسل گئے۔ بعض نے عقل کو حاکم مطلق بناڈالا اور نقل کو پس پشت ڈال دیا اور ایسے عقائد کا مجموعہ تیار کیا جس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ معتزلہ تھے اور کچھ لوگوں نے انسانی عقل کو بالکل معطل کردیا؛ بلکہ خود انسان کو اس کی تمام حرکات وسکنات میں مجبور محض بنادیا، یہ جبریہ تھے۔

اور ان دونوں: افراط اور تفریط کے بیچ اہل سنت والجماعت تھے۔ انہوں نے عقل اور نقل دونوں کو اعتدال اور فرق مراتب کے ساتھ جمع فرمایا۔ انہوں نے نقل کو حاکم اور عقل کو خادم بنایا، عقلی دلائل سے وہی احکام ثابت کیے جو کتاب وسنت کی نصوص سے ثابت ہیں۔

عقیدہ کے باب میں اہل سنت والجماعت کی نمائندگی خلف میں سے دو اہم شخصیات نے کی

(۱) امام ابوالحسن اشعریؒ (۲) امام ابومنصور ماتریدیؒ۔ ان دونوں حضرات نے اپنی محنتوں سے دو مکاتب فکر کی بنیاد رکھی، جو ان دونوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے اشعریہ اور ماتریدیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بلاشبہ ان دونوں مکاتب فکر کے درمیان بھی بعض مسائل میں اختلاف ہے؛ بلکہ بعض علماء کے بقول بارہ مسائل میں اختلاف ہے؛ لیکن اس کے باوجود یہی دونوں مکاتب فکر اہل سنت والجماعت کے نمائندہ رہے۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان دونوں مکاتب فکر میں کچھ غالی اور متقشف قسم کے افراد بھی ہیں، جن کے بعض افکار ونظریات، اہل سنت والجماعت کے عمومی منہج اور مجموعی مزاج ومذاق سے میل نہیں کھاتے۔ اس طرح کے نظریات ان کے ذاتی ذوق کے عکاس ہیں، وہ اشعریہ اور ماتریدیہ کے ترجمان نہیں ہوسکتے، اس طرح اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے باب میں تین مکاتب فکر ہوئے:

(۱) عقیدۃ السلف (۲) اشعریہ (۳) ماتریدیہ

عقیدہ کے باب میں سلف کا منہج یہ تھا کہ عقیدہ سے متعلق جتنی باتیں، قرآن کریم اور صحیح احادیث میں آئی، ہیں وہ ان کو بعینہٖ تسلیم کر لیتے تھے، نہ کیفیت میں بحث کرتے تھے، نہ ان کا انکار کرتے تھے اور نہ ہی مخلوق کے مشابہ قرار دیتے تھے۔ وہ عقیدہ کے باب میں، خاص طور سے الٰہیات کے باب میں، زیادہ بحث ومباحثہ کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں عقیدہ کی تعبیرا نہی الفاظ اور عبارات سے ہوتی ہے جو قرآن وحدیث میں آچکے ہیں، بہت سے وہ الفاظ جو خلف کے یہاں رائج ہیں، سلف کی کتابوں میں ان الفاظ کا ذکر تک نہیں ملتا۔ جیسے: قدیم، حادث، جوہر، عرض، مرکب، بسیط، جزء لایتجزی، ہیولیٰ، صورتِ جسمیہ وغیرہ۔

صفات باری کے مسئلہ میں سلف کا عقیدہ یہ ہے کہ جتنے بھی اوصاف اللہ کی طرف قرآن و حدیث میں منسوب ہیں، وہ سب اللہ کے لئے ثابت ہیں، ان صفات کی نہ تحدید ہوسکتی ہے، نہ انکار، نہ تاویل، خاص طور سے وہ صفات جو متشابہات کی قبیل سے ہیں، جیسے اللہ کے لئے استوا، ید، وجہ، عین، رجل، وغیرہ، سلف ان پر بھی ایمان لاتے، ان کو اللہ کے لئے ثابت کرتے اور ان کی کیفیات کو

اللہ کے سپرد کرتے۔

عقیدہ سلف کی نمائندہ کتابیں یہ ہیں:

(۱) العقیدۃ الطحاویہ

(۲) کتاب الایمان لابن مندہ

(۳) کتاب الشیخ ابی عبید القاسم ابن سلام

(۴) امام احمد کی مسند

(۵) الاسماء والصفات للبیہقی

(۶) اسی طرح صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی کتاب الایمان وغیرہا۔

نیز علامہ ابن تیمیہ نے ''العقیدۃ الواسطیۃ'' اور ''المجموع'' میں، علامہ ابن قیم نے ''زاد المعاد'' میں، شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے کتاب التوحید میں، سید احمد شہیدؒ نے ''تقویۃ الایمان'' میں منہج سلف کی کامیاب نمائندگی کی ہے۔

اشاعرہ

یہ متکلمین کی وہ جماعت ہے جو امام ابوالحسن اشعریؒ کی طرف منسوب ہے، حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ کا پورا نام ابوالحسن علی بن اسماعیل ہے، آپ مشہور صحابیؓ حضرت ابوموسی اشعریؓ کی اولاد میں ہیں، آپ کی ولادت بصرہ میں ۲۶۰ھ میں ہوئی، بچپن میں ہی آپ کے والد کا انتقال ہوگیا، پھر آپ کی والدہ نے معتزلہ کے سردار شیخ ابوعلی جبائی سے شادی کرلی، اس طرح آپ کی تعلیم وتربیت معتزلی افکار ونظریات کے مطابق ہوئی، اللہ نے آپ کو بلا کا حافظہ اور حیرت انگیز چرب زبانی اور فصاحت و بلاغت سے نوازا تھا، اسی لئے ابوعلی جبائی مناظرہ کی مجلسوں میں امام اشعری کو آگے بڑھاتے تھے۔

آپ تقریباً چالیس سال تک معتزلی افکار کے حامل اور ان کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم رہے، مگر عالم اسلام کے اندر عقائد سے متعلق پائے جانے والے مختلف مذاہب اور ان کے اختلافات اور تہہ در تہہ عقلی باتوں نے آپ کے دل میں بے چینی پیدا کردی تھی، آخر وجوب عدل اور قیام اصلح (کیا اللہ پر عدل کرنا اور بندوں کی مصلحت کی رعایت کرنا فرض ہے؟) کہ مسئلہ میں حضرت شیخ ابوعلی جبائی

سے اختلاف ہوا اور آپ معتزلہ کے مسلک سے الگ ہوگئے اور پندرہ دن تک گھر میں محصور ہوکر اپنے منہج کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر بصرہ کی جامع مسجد میں آکر اپنے عقائد کا اعلان کیا۔ امام ابوالحسن اشعریؒ نے عقائد کے مسائل کو از سر نو مرتب کیا اور خشک ظاہریت اور مبالغہ آمیز عقلیت کے درمیان ایک معتدل طریقہ اختیار کیا، جہاں انہوں نے عقل کے ساتھ نقل کو بھی معیار بنایا، آپ کی وفات بغداد میں ۳۳۳ھ میں ہوئی، آپ نے پچاس کے قریب کتابیں تصنیف کیں، چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مقالات الاسلاميين (۲) الإبانة عن اصول الديانة (۳) اللُّمع في الرد على أهل الزيغ والبدع.

اشعری مکتب فکر کے نمائندہ حضرات اکثر شوافع اور محدثین رہے؛ کیوں کہ امام ابوالحسن اشعریؒ خود شافعی المسلک تھے۔

شیخ ابومنصور ماتریدی علیہ الرحمہ

امام ابومنصور ماتریدی عقیدہ کے باب میں اہل سنت والجماعت کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ مؤرخین نے آپ کو ''امام الہدی'' اور ''امام المتکلمین'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ آپ کا پورا نام ابومنصور محمد بن محمد بن محمود ہے۔ آپ کی نسبت ماتریدی ہے جو ماوراء النہر کے مشہور شہر سمرقند کا ایک محلّہ ہے، تاریخی کتابوں میں آپ کی تاریخ ولادت کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ مؤرخین کا اندازہ ہے کہ آپ عباسی خلیفہ متوکل کے دور میں پیدا ہوئے، آپ علمی اور دینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، بچپن سے ہی علم دین کی تحصیل میں لگ گئے اور خاص طور سے تین فنون کے ماہر ہوئے۔ تفسیر، اصولِ فقہ اور علم کلام، آپ کے دور میں معتزلہ کا بڑا زور تھا، آپ نے عقلی دلائل سے ہی معتزلہ کی تردید کی اور بڑی تنقیح اور غور وفکر کے بعد اسلامی عقائد کے اثبات کا ایک نیا منہج مرتب کیا، جو ''الماتریدیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جیسے **كتاب التوحيد، المقالات، الرد على القرامطة، بيان وهم المعتزله، الجدل، مآخذ الشرائع في اصول الفقه.** وغیرہ۔

آپ کی وفات ۳۳۳ھ میں ہوئی، آپ کی قبر سمرقند میں ہے۔ زیادہ تر حنفیہ نے عقیدہ میں ماتریدی مسلک کو اختیار کیا۔

(۲) فقہ اسلامی اور اہل سنت والجماعت

فقہ اسلامی، قرآن اور حدیث کا نچوڑ اور اسلامی شریعت کا سب سے کشادہ باب ہے، یہ انسانی زندگی سے مربوط ایسا زندہ اور متحرک علم ہے جس میں انسانی زندگی کے پیش آمدہ مسائل کو کتاب و سنت کے نصوص کی روشنی میں حل کیا جاتا ہے۔ اس علم کے اصول اور قواعد ثابت شدہ ہیں اور ان کا دائرۂ اثرا تنا عام ہے کہ وہ ہر زمانہ کی ترقیات کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کتاب وسنت میں جو احکام پائے جاتے ہیں، ان کی بنیادی قسمیں تین ہیں:

(۱) وہ احکام جن کا تعلق انسان کے عقائد سے ہے، جیسے ایمان باللّٰہ و ملٰئکته و رسله.

(۲) وہ احکام جن کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء جیسے ہاتھ، پیر، کان، ناک، زبان وغیرہ سے ہے، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، تجارت اور سیاست وغیرہ وغیرہ۔

(۳) وہ احکام جن کا تعلق باطنی اخلاق وعادات سے ہے، جیسے حب اللّٰہ و رسوله، اللہ کو یاد کرنا، اللہ سے ڈرنا، دنیا سے بے رغبتی، صبر وشکر، توکل وقناعت اور خشوع وخضوع وغیرہ۔

کتاب وسنت میں اور قرونِ اولیٰ میں فقہ اسلامی کا اطلاق ان تینوں پر ہوتا تھا، یعنی پوری شریعت میں گہری بصیرت اور سوجھ بوجھ جیسے قرآن میں ہے: ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ'' حدیث میں ہے: ''مَنْ يرد اللّٰه به خيراً يفقه في الدين'' ان نصوص میں فقہ سے مراد پورے دین اسلامی میں مہارت حاصل کرنا ہے نہ کہ صرف عملی احکام میں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے عقیدہ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، جس کا نام امام صاحبؒ نے ''الفقہ الاکبر'' رکھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کے دور تک فقہ کا اطلاق ان تینوں پر ہوتا تھا۔ بعد میں جب ہر قسم سے متعلق مسائل کی کثرت ہوئی تو ضرورت پڑی کہ ہر فن کو مدون کیا جائے، چنانچہ عقیدہ سے متعلق احکام ومسائل کے لئے ''علم العقیدہ والکلام'' کا وجود ہوا اور انسان کے ظاہری اعمال کے لئے ''فقہ اسلامی'' بحثیت ایک مستقل فن کے وجود پذیر ہوئی۔

اور باطنی اخلاق وعادات کے لئے ''علم التزکیہ والاحسان'' یا ''علم تصوف'' کا وجود ہوا۔

فقہ اسلامی کی جدید تعریف اب یہ ہوئی کہ: فقہ اسلامی ان احکام کے جاننے کا نام ہے، جو مصادر شریعت: کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے ثابت ہوں اور مکلّف انسان کی عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں۔

اصطلاحی فقہ کتاب وسنت میں یہ تینوں قسم کے احکام، دین کے لازمی اجزا باہم انتہائی مربوط ہیں:

بلکہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہے، اس لئے کتاب وسنت میں ان احکام کو الگ الگ بیان نہیں کیا گیا ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ عقائد سے متعلق احکام ایک جگہ ہوں، ظاہری اعمال ایک جگہ ہوں اور باطنی اعمال ایک جگہ ہوں؛ بلکہ کتاب وسنت کے سیاق میں یہ سارے احکام ایک ساتھ چلتے ہیں؛ بلکہ بعض جگہ تو ایک دوسطروں میں ہی تینوں قسموں کو جمع کردیا گیا ہے۔ جیسے اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا. (قرآن) اور حدیث جبرئیل وغیرہ۔

نیز قرآن کریم اصلاً کتاب ہدایت ہے نہ وہ کتابِ فقہ ہے اور نہ ہی کتاب نحو وصرف اور بلاغت، اس لئے کتاب اللہ میں عملی احکام سے متعلق زیادہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ اسی طرح احادیث میں بھی وہی فروعی اور جزوی احکام بیان کیے گیے ہیں، جن کی عہد رسالت میں ضرورت تھی، البتہ کتاب وسنت کے نصوص میں ایسے اصول اور قواعد موجود ہیں جو قیام دنیا تک کی ضرورت کے لئے کافی ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانہ اور ہر حالت کے فروعی احکام حل کیے جاسکتے ہیں۔

عہد رسالت کے بعد جب دنیا بھر میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، بڑے بڑے متمدن ممالک اسلام کے زیر حکومت آئے، بے شمار قوموں نے اسلام قبول کیا، نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں، نئے حالات ونظریات سامنے آئے تو اس وقت کے فقہاء اور مجتہدین کو کتاب وسنت کے اصول کی روشنی میں قیاس واجتہاد کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے اپنے قیاس اور اجتہاد سے مسائل حل کیے، اس طرح جزئی اور فروعی احکام میں اضافہ ہوتا رہا۔

قیاسی اور اجتہادی مسائل میں فقہاء کے مناہج اور نقاط نظر کا اختلاف فطری تھا، چنانچہ بہت سارے فقہی منہج وجود میں آئے ان میں دو فقہی مکتب فکر کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی، ایک حجازی مکتب فکر اور ایک عراقی مکتب فکر اور ان دونوں مکاتب فکر کے اندر سینکڑوں فقہاء تھے جو اپنے اپنے منہج اور

اصول کے مطابق مسائل حل کیا کرتے تھے۔ یہی سلسلہ دوسری اور تیسری صدی تک چلتا رہا، دوسری صدی جو علوم وفنون کی تدوین کی صدی ہے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنے مایہ ناز شاگردوں کے ساتھ، فقہ اسلامی کی تدوین کی بنیاد ڈالی، جسے بعد میں آپ کے شاگردوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

چوتھی صدی ہجری میں جب لوگوں کے دینی حالات کمزور ہوگئے؛ قیاس واجتہاد کے لئے مطلوبہ صلاحیتیں کمزور پڑ گئیں، ظالم حکام کا تسلط ہوا اور کچھ فاسد مزاج طبیعتوں نے فقہاء کے فتاویٰ میں سہولیات اور رخصتوں کو ٹٹولنا شروع کردیا تو اس دور کے علما نے اس فتنہ کی روک تھام کے لئے چار مذاہب کی لاعلی التعیین تقلید کے وجوب پر اجماع فرمایا، وہ چار مذاہب یہ ہیں: مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی، اور اس دور سے لے کر آج تک ہر دور کے اہل سنت والجماعت نے اس اجماع کی تائید کی اور دو چار افراد کے سوا، اسلام کی پچھلے ایک ہزار سال کی تمام نامور شخصیات کسی نہ کسی فقہی مسلک کی مقلد رہی ہیں۔

(٣) اہل سنت والجماعت اور اسلامی تصوف

علمی طور پر اہل سنت والجماعت کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اصلاح عقائد اور ظاہری اعمال پر توجہ کے ساتھ ساتھ، تزکیۂ اخلاق اور روحانی وقلبی کمالات کے حصول پر بھی کافی توجہ دی ہے۔ اصطلاح میں تزکیۂ اخلاق کا ہی دوسرا نام تصوف ہے۔

تصوف کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہاں تصوف سے مراد خالص اسلامی تصوف ہے جو اپنے اصول میں کتاب وسنت کا پابند ہے اور غیر منصوص فروعی چیزوں میں، فقہ اسلامی کی طرح انہی اصول سے استفادہ کرتا ہے اور وقت اور زمانہ کے لحاظ سے ہر لمحہ قابل تجدید اور تغیر پذیر بھی ہے۔ تصوف کی بحث میں نہ وہ خانقاہیں مراد ہیں، جو دراصل دھوکہ وفریب کی دوکانیں ہیں، جہاں اولیاء اللہ سے عقیدت ومحبت کے نام پر شرک وبدعات کا کاروبار چل رہا ہے اور نہ وہ نااہل موروثی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور پیروں سے کوئی غرض ہے جو کج روی میں عام انسانوں سے بدتر اور تمام اخلاقی بیماریوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

تصوف کیا ہے؟ ابتدائی پس منظر

ہر مسلمان اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ نبی کریم ﷺ جامع ترین دین یعنی اسلام کے ساتھ مبعوث ہوئے، اس عالمگیر مذہب میں دنیا اور آخرت کے تقاضوں کو بڑے متوازن انداز میں جمع کیا گیا، روحانیت اور مادیت کو ہم رشتہ کیا گیا، انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تحفظ ہوا اور زندگی کے مختلف شعبوں کو اور ایک انسان کے مختلف احوال اور اس کے تقاضوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا، اس دین کا سب سے بڑا اور کامل ترین عملی نمونہ، خود نبی کریم ﷺ کی ذات مقدس ہے اور یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی پیروی کرکے بندہ، اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کا مستحق اور اس کا محبوب بن جاتا ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل تین اہم شعبے دریافت ہوتے ہیں:

(۱) ایمان

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، وحی ورسالت، ملائکہ، قیامت، حشر ونشر اور جنت ودوزخ جیسی غیبی حقیقتوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ تعلیمات دی ہیں ان سب کو حق ماننا اور دل سے ان کی تصدیق کرنا۔

یہ دینِ حق کا سب سے اہم شعبہ ہے اور یہی پورے دین کی اساس وبنیاد ہے اور یہی علم عقائد کا موضوع ہے۔

(۲) اعمالِ صالحہ ظاہرہ

اس سے مراد وہ تمام تر عملی حصہ ہے، جو ظاہری اعضائے بدن سے تعلق رکھتا ہے، جو انہی اعضاء سے انجام دیئے جاتے ہیں، اس میں تمام اسلامی عبادات، دعوت وتبلیغ، جہاد وقتال، معاملات ومعاشرت کے آداب وغیرہ داخل ہیں۔ یہ شعبہ گویا دین کا پورا قالب اور مکمل ڈھانچہ ہے اور یہی اسلام کا عملی نظام ہے اور یہی فقہ اسلامی کا موضوع ہے۔

(۳) روحانی وقلبی صفات اور تزکیۂ اخلاق

اہل علم جانتے ہیں کہ کتاب وسنت میں عقائد اور ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ، تزکیۂ اخلاق پر بھی کافی زور دیا گیا ہے اور آپ علیہ السلام نے اپنے عمل سے اس کے خدوخال واضح کیے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی عملی زندگی میں اور آپ کی تعلیمات میں، اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت، یقین وتوکل، احسان واخلاص، بردباری اور تواضع، زہد وقناعت، اخوت وبھائی چارگی، ایثار اور جذبۂ قربانی جیسی بے شمار روحانی وقلبی کیفیات کے فضائل اور ان کے حصول پر زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح سے یہ بھی ایک مستقل شعبہ ہے اور علم تصوف کا موضوع ہے۔

نبی کریم ﷺ کی مقدس ذات تینوں شعبوں کے لئے مکمل نمونہ اور ان تینوں شعبوں کی جامع تھی اور یہی جامعیت کسی درجہ میں حضرات صحابہؓ کو حاصل تھی؛ لیکن بعد کے ادوار میں علماء وصلحاء ذاتی طور پر اگرچہ تینوں شعبوں سے وابستہ رہے؛ لیکن اپنی اپنی صلاحیت واستعداد اور ذوق وماحول کی

وجہ سے انہوں نے کسی ایک شعبہ کو ہی اپنی خدمت کا عنوان بنایا اور ان تینوں شعبوں کے ماہرین عملی طور پر الگ ہوگئے۔ چنانچہ محدثین اور متکلمین نے عقائد کو اپنا موضوع بنایا۔ حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے ظاہری اعمال یعنی فقہ کو اپنا موضوع بنایا اور ان کے مسائل کی تنقیح وتفصیل کی، بالکل اسی طرح حضرات صوفیاء رحمہم اللہ نے دین کے تیسرے شعبہ یعنی باطنی کیفیات اور تزکیۂ اخلاق کی خدمت وحفاظت کی اور اس باب میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نیابت کی۔

تصوف کی حقیقت

تصوف نام ہے برے اخلاق وعادات سے دلوں کو صاف رکھنا اور ان کی جگہ اچھے اخلاق وعادات سے قلوب کو آراستہ کرنا۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ طریقِ تصوف کتاب وسنت میں مقید ہے۔(۱)

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: کتاب وسنت کا ہر معاملہ میں لحاظ، اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بکثرت اس کی ہدایات موجود ہیں۔(۲)

تصوف کی حقیقت قرآن وسنت سے ثابت ہوجانے کے بعد، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اس کی جزئیات اور اس کی تفاصیل میں حالات اور زمانہ کے لحاظ سے حضرات صوفیاء نے مختلف طریقے اختیار کیے اور یہ طریقے فی نفسہ صحیح بھی ہیں، جب تک کہ منکرات کے درجہ میں نہ آتے ہوں۔ اس لیے ہر دور میں علماء اہل سنت والجماعت نے تصوف سے کم وبیش اپنا تعلق رکھا تا کہ ظاہری اعمال کی صحت کے ساتھ ساتھ باطنی کیفیت بھی روشن رہیں۔

نوٹ: اہل سنت والجماعت کا حصہ بننے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تصوف کے کسی سلسلے سے جڑنا اس کے لیے ضروری ہے؛ بلکہ فکری طور پر اس کے جواز اور شرعی ہونے کا اعتقاد رکھنا کافی ہے، یعنی منکر تصوف کم از کم نہ ہونا ضروری ہے۔

---

(۱) الفرق بین اولیاء الرحمٰن وبین اولیاء الشیطان: ص۴۴ (۲) ایضاً